حیدرآباد بک ڈپو، حیدرآباد دکن

شخصیّت و کردار

شیر محمد اختر

ادارۂ اشاعتِ اُردو
حیدرآباد۔ دکن

قیمت دو روپیہ پانچ آنہ سکۂ عثمانیہ
قیمت دو روپیہ کلدار

طبع اول ——— ایک ہزار

ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۵ء

پروپرائیٹر

سید عبدالرزاق

مطبوعہ

رزاقی مشین پریس

حیدرآباد۔ دکن

شخصیت

کردار

شخصیت

شخصیت کیا ہے؟

زندگی ایک کہانی ہے۔ ایک بیتی، جو سمے کی ریل پیل اور اس کے گھڑی پل کے ساتھ ساتھ ہر وقت سمٹتی اور پھیلتی رہتی ہے۔ ہم سب اپنے اپنے رنگ میں اسے کہتے اور اپنے اپنے رنگ میں اسے سنتے ہیں۔ کسی نے دکھ سکھ کی کہی اور ہم چپ سادھ کے بیٹھ گئے۔ کوئی اپنے ہی منگل گانے لگا تو ہم بھی کھلکھلا اٹھے۔ قصہ مختصر جیسی کہانی ہو ویسا ہی اس کا اثر ہوتا ہے۔

یہاں ایک آدھ نہیں کروڑوں انسان بستے ہیں۔ اور ہر انسان اپنی اپنی جگہ پر ایک کہانی کہتا ہے۔ بری یا بھلی۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی کہانی آپ نہیں کہتے بلکہ دوسرے تیسرے اُسے سناتے ہیں۔ جہاں دو چار انسان مل بیٹھے انھیں کا چرچا ہونے لگتا ہے۔ اور اگر چرچا نہ بھی ہو پھر بھی اپنے طور پر ہم ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے کوئی بڑی طاقت ہمیں اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ اُن کی

سُنی سنائی باتیں اور دیکھے بھالے انداز ذہن پر کچھ اس طرح نقش ہو جاتے ہیں کہ لاکھ جتن کرنے پر بھی محو نہیں ہوتے۔

شہر کے باغ میں لوگ سیر میں مصروف ہیں۔ ایک ہجوم ہے کہ ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ لڑکے کھیل رہے ہیں۔ بچے شور سے باغ کو سر پر اٹھائے ہیں۔ نوجوان معروف گلگشت ہیں۔ نوجوان لڑکیاں سمٹی سمٹائی ایک طرف جا رہی ہیں۔ اچانک باغ میں ایک کار رکتی ہے۔ کار نئی ہے۔ جس کا شوخ رنگ دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے تو اس میں سے ایک مشہور ریاست کی راجکماری برآمد ہوتی ہے۔ ہجوم کی توجہ کار کی طرف تھی ہی۔ اُن میں سے کسی نے اسے پہچان لیا۔ زیر لب "راجکماری" کہا۔ الفاظ ہوا میں تیر کر سارے باغ میں پھیل گئے۔ اور ہر شخص ان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ لڑکوں کا کھیل رک گیا۔ بچے کھڑے ہو گئے۔ نوجوان ٹھٹک کر راجکماری کو دیکھنے لگے۔ لڑکیاں اپنے پلّو سنبھال رہی ہیں باغ میں چند منٹ قبل ایک بے آہنگی تھی۔ مگر اب راجکماری نے ایک نئی کیفیت پیدا کر دی۔ اس کا باعث ــــ؟ ایک شخصیت کا باغ میں آنا ہے۔ موٹر کے رنگ اور بناوٹ سے جو تاثر پیدا کیا تھا اُسے راجکماری کی شخصیت نے اور نمایاں کر دیا

آپ ایک محفل میں جاتے ہیں۔ خوب رونق ہے۔ سب لوگ

خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ باتیں چل رہی ہیں۔ کسی کا تعارف کرایا جا رہا ہے۔ دوسرا ہاتھ ملاتے ہوئے جھکتا ہے۔ "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" کے الفاظ کے ساتھ رسمی مسکراہٹ لبوں پر کھیل جاتی ہے۔

یہ کیا؟ ساری محفل خاموش ہوگئی۔ ایک معمر شخص سادہ لباس پہنے اندر داخل ہوا۔ کسی نے آہستہ سے کہا "ڈاکٹر ضیا رالدین"۔ فلسفہ کے مشہور پروفیسر۔ محفل کی حالت بدل گئی۔ سنجیدگی نے کمرے پر تسلط جمانا شروع کردیا۔ ہنسی مذاق ختم ہوگیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ ایک کمزور اور معمر شخص کے آنے سے ساری بزم کا رنگ کیوں تبدیل ہوگیا--؟ صرف اس لئے کہ وہ ایک مشہور شخصیت ہے۔

آپ نے روزمرہ کی ان دو مثالوں سے دیکھا کہ شخصیت دو طرح کی ہے۔ ایک وہ شخص جو اپنی کسی خاص صفت کی وجہ سے دوسرے لوگوں سے ممتاز ہے۔ دوسری راجکماری جسے قدرت نے دنیاوی عزوجاہ سے مالامال کر رکھا ہے۔ مرتبہ اور دولت نے مل کر اس کی شخصیت بنانے میں امداد کی ہے۔

لقمان کا نام لیتے ہی ہمارے ذہن میں ایک ایسے حکیم کا تصور آجاتا ہے جس کی حکمت ضرب المثل بن چکی ہے۔ وہ انسانیت کا محسن تھا۔ لقمان کی ذات ایک نیک اور فیض رساں شخصیت تھی۔

مادام کیوری (Curie) کے نام سے ہمیں ریڈیم کی ایجاد

یاد آجاتی ہے۔ ریڈیم کے فوائد پر نظر پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی کیوری کی موت کی یاد تازہ ہوکر ہمیں افسوس کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ کاش وہ اتنی جلدی نہ مرتی۔ اس نے اپنی ایجاد کے ذریعہ نسلِ انسانی پر ایک احسان کیا۔

علامہ اقبال کا ذکر آتے ہی ہمارے سامنے ان کی شاعری آجاتی ہے۔ پھر آپ اُن کے بعض اشعار اور مصرعے گنگنانے لگتے ہیں جو آپ کو پسند ہیں اور جنھیں آپ کے ذہن نے محفوظ کرلیا ہے یہ اشعار کا گنگنانا بتاتا ہے کہ آپ شاعر سے کس قدر زیادہ متاثر ہوتے ہیں آپ نے بھی اس حسن و جمال کو پالیا ہے جو شاعر اپنے فن کے ذریعے آپ تک پہنچانا چاہتا تھا۔ آپ کے دل میں شاعر کے لئے تقدس اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے

ٹیگور کا لفظ سحرِ بنگال کی یاد دلاتا ہے۔ بنگال کے نغمات کی سریلی مدھری آواز ہمارے کانوں میں آنے لگتی ہے۔ ہم جھومتے ہیں اور خوشی سے ہماری روح وجد میں آجاتی ہے

لیکن ان کے ساتھ ہی اگر قاضی عبدالغفار اور "لیلیٰ کے خطوط" کا ذکر چھڑ جائے تو آپ کے سامنے سماجی عیوب کی ناخوشگوار تصویر آجاتی ہے۔

اقبال اور ٹیگور کو آپ عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اپنے دل میں اُن کے لئے تقدس کا جذبہ رکھتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ ادبی

شخصیتیں ہیں۔ ان لوگوں کا اثر اور اُن کی یاد اُن کے کلام میں موجود ہے۔ ایک کی بلند پروازی اور دوسرے کا جمالیاتی پہلو دونوں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار کی شخصیت ہمیں اُن کی قابلیت ماننے پر مجبور کرتی ہے۔ "لیلیٰ کے خطوط" اُن کا ایک لازوال کارنامہ ہے۔ یہ ہماری زندگی کا وہ پہلو ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ عورت کی مظلومیت کی داستان۔

نپولین کا نام آجائے تو آنکھوں کے سامنے میدان جنگ کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ آپ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ آپ کوئی "دخبروں کی ریل" دیکھ رہے ہیں۔ بمباری، دھواں، تباہی، بربادی، بلبلاتے بچے، خانماں برباد لوگ، موت کی گرم بازاری، ہر طرف لاشیں اور خون۔ فرانس کے لوگ خوش ہیں۔ فتح کے شادیانے بجا رہے ہیں۔ اچانک جنگ کا پانسہ پلٹا۔ شکست پر شکست۔ فرانس ہار گیا۔

پھر نپولین کا سراپا سامنے آنے لگتا ہے۔ لمبا کوٹ اور چھوٹی سی ٹوپی، ایک ہاتھ جیب میں۔ ماتھے پر بالوں کی ایک لٹ، خمیدہ کمر، ہارا ہوا انسان۔

نپولین کی شخصیت طاقتور اور حیران کن ہونے کے علاوہ نقصان رساں بھی تھی۔ وہ غیر معمولی انسان تھا لیکن دوسروں کے لیے پیغام اجل بن کر آیا اور خود اپنی تباہی کا موجب بنا۔ اس نے دنیا میں ہلچل مچا دی۔ وہ دیوانہ وار بڑھا۔ ایک جنون تھا جو اُسے آگے بڑھنے پر

مجبور کر رہا تھا۔ اس کی ذات واقعی انسانی تاریخ میں ایک زندہ جاوید
ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کی شخصیت سے محبت نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ
وہ تکلیف دہ تھی۔

یہی حال ہٹلر کا ہے۔ اس کی ذات بھی قابل نفرت ہے۔ جس
نے امن عالم کو خطرہ میں ڈال کر ساری دنیا کو جنگ میں دھکیل دیا۔
خونیں داستان کا دوسرا نام ہٹلر ہے۔

کولمبس، مارکونی، اجمل خاں، مہاتما گاندھی، جناح، جواہر لال کا
نام لیجیے تو آپ کے ذہن میں ایسے لوگ آ جاتے ہیں جن کی زندگی خدمت
خلق میں گزری۔ کولمبس نے ایک نئی دنیا معلوم کی۔ مارکونی نے بے تار برقی
کی ایجاد سے وہ خدمت سرانجام دی ہے کہ شاید ہی کوئی اور انجام
دے سکے۔ باقی نام ہندوستان کی آزادی کے حامل ہیں۔ اُن کی
قربانیوں نے انھیں بھارت ماتا کا محبوب سپوت بنا دیا ہے۔

اب تک ہم نے ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کی شخصیت یا تو
قابل قدر ہے یا قابل نفرت۔ بہرحال ان لوگوں نے خداداد قابلیتوں کا
مظاہرہ ضرور کیا ہے۔ اس کی شکل خواہ کیسی ہی سہی۔

حضور نظام حیدرآباد، مہاراجہ پٹیالہ، راجکماری کپورتھلہ۔ یہ بھی
چند شخصیتوں کے نام ہیں۔ مگر ان کی حیثیت دوسری ہے۔ وہ اپنی ذات
میں ایک ایسا وصف رکھتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کا نام لیتے ہی

ان کی شخصیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کو اپنی شخصیت نمایاں کرنے کے لئے کسی خاص جد و جہد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ قدرت انھیں ایسے مقام پر لاکھڑا کرتی ہے جس سے اُن کی ذات قابل توجہ بن جاتی ہے

شخصیت ایک ذاتی جوہر ہے جو خوش نصیب انسانوں کو میسر آتا ہے۔ اس کے ساتھ انسان کی وقعت زیادہ ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ذاتی خوبی ہے جس کے ہم خود مالک ہوتے ہیں یہ خوبی بعض حالات میں ہمیں فطرت کی طرف سے ملتی ہے اور بعض حالات میں ہم خود اسے پیدا کر کے اس کی نشو و نما کرتے ہیں۔

اب ہم شخصیت کی تعریف یوں کر سکتے ہیں ایک شخص کی زندگی کا وہ حصہ جو وہ دوسروں میں گزارتا ہے۔ اور جس کے ذریعہ وہ ایسا شدید تاثر پیدا کرتا ہے کہ وہ دوسروں کے ذہن پر چھا جاتا ہے۔

جب ہم کسی شخص کی خاص صفات کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں تو اس کی شخصیت خود انسان کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس شخص کی ذات اور وہ کام جو اس نے سرانجام دیئے یکجا ہو جاتے ہیں۔ کام کا ذکر آتے ہی وہ شخص سامنے آجاتا ہے اور اس شخص کے نام سے اس کا کام یاد پڑتا ہے۔ اور پھر کام اور نام۔ دونوں ایک ہو جاتے ہیں

شخصیت کی تعریف یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ وہ چند افعال کا مجموعہ ہو یا ایک کام کی جسمانی شکل

جب ہم ایک شخصیت کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ فلاں کتاب کا مصنف ہو

فلاں تصنیف اس کی تخلیق ہے تو اگرچہ آپ محض اس کے کام کا ذکر کر رہے ہیں مگر اس وقت آپ کے ذہن کی آنکھ اس شخص کا سراپا دیکھنے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر رابندر ناتھ ٹیگور کو لیجئے۔ وہ ایک شخصیت تھے۔ انھوں نے اپنی خداداد دولیتوں سے کام لیا۔ ان کے اندر ایک جوہر تھا۔ اس کی نشو و نما کی۔ اپنے محسوسات، جذبات اور مشاہدات کو الفاظ کا جامہ پہنایا۔

لکھنے کا یہ جوہر فن کی حیثیت اختیار کر گیا اور وہ شخصیت کہلائے انھوں نے اپنے اس فن کے ذریعہ ایک نمایاں کام کیا جو اس زمانے میں شاید کسی نے بھی نہ کیا ہو۔ وہ ایک بلند پایہ مصنف تھے۔ اسی وجہ سے اُن کی شہرت ہوئی۔ لوگوں کے ذہنوں پر اُن کی فن کاری نے اپنا ایک خاص اثر ڈالا اور اس کی یاد چھوڑی۔ جو انکی شخصیت بنانے کا باعث ہوئی

اُن کی شخصیت خود اُن کی ذات ہے

اُن کی شخصیت اُن کے کام اور نام میں ہے۔ اُن کا کام اُن کی ذات میں ہے اور اُن کی ذات ان کا کام، آپ گیتا نجلی کا نام لیجئے تو آپ کا ذہن فوراً ٹیگور کی طرف منتقل ہو جائے گا آپ گیتا نجلی کا مصنف کہئے تو بھی رابندر ناتھ ٹیگور کا نام ذہن میں آئے گا۔ تصنیف کے ذریعے مصنف کی یاد پڑتی ہے اور مصنف کی ذات خود اس کی تصنیف میں مدغم ہو جاتی ہے

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اچھی یا بُری شخصیت کی نشو و نما بعض حالتوں میں ذہن کی خاص بناوٹ یا کردار کی بعض خصوصیات کے مطابق ہوتی ہے۔

ایک سائنس داں کی شخصیت میں ہمیں ایک خاص جوہر نظر آتا ہے۔ جس
کی نشو و نما میں اس سائنسدان نے خاص توجہ دی۔ اس کے اندر مطالعہ کا
شوق، ایجاد کرنے کا رجحان، انسانیت کی خدمت کا جذبہ، تحقیقات کے لئے
صبر آزما استقلال اور تجربات کرنے کا حوصلہ ہی تھا جس نے شخصیت
کی تکمیل کی۔

ٹیگور ادب کی پیداوار ہیں۔ ان کے اندر فطری طور پر دیکھنے اور
محسوس کرنے کے جوہر موجود تھے۔ انھوں نے حسن کو دیکھا، اسے سمجھا
اور پھر قدرت کے جمال کو الفاظ کا جامہ پہنایا۔ ٹیگور تخئیل پرست تھے۔
ان کا تخئیل بلند اور ارفع تھا۔

ایک طنز نگار ادیب بھی ادب کی پیداوار ہوتا ہے۔ مگر وہ زندگی
کو برہنہ دیکھتا ہے۔ وہ اس کے تلخ حقائق کو بغیر تخئیل کی رنگ آمیزی
کے پیش کرتا ہے۔ اس کی شخصیت کا انحصار انھیں تلخ حقیقتوں پر مبنی ہے
اس لئے اس میں یہی حقیقت پسندی نظر آتی ہے۔

ہمارے زمانے میں ہٹلر کی شخصیت حیران کن ہے۔ وہ دنیا کے
لئے ایک خطرناک انسان ثابت ہو رہا ہے۔ اس کا باعث اس کا وہ خاص
جذبہ ہے جو نسلی امتیاز پر قائم کیا گیا ہے۔ اس امتیاز کو برقرار رکھنے کیلئے اسکے اندر استقلال
جرأت، اور خودی کے جذبات زیادہ ہوگئے ہیں ان اوصاف کی روشنی میں اسکی شخصیت
قابل تعریف ہے۔ مگر چونکہ اسکی تہ میں نسلی امتیاز کا جذبہ کارفرما ہے اسلیئے یہ جذبہ ہی اسے لے ڈوبا ہے
کو ملبس پیدائشی طور پر جان جوکھوں میں ڈالنے کی طرف مائل تھا۔

جرأت سے کام لینا اُسے فطرت سے ودیعت کیا گیا تھا بچن کا موجد سٹیفنس
ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ خواب دیکھنے کا عادی تھا۔ مگر اس کے خوابوں
میں اعداد پسندی اور ایجاد کرنے کا شوق غالب رہا۔
اسی طرح جب ہم غور کرتے ہیں اور ان لوگوں کی زندگیوں کا گہرا
مطالعہ کرتے ہیں، جن کی کہانیاں دوسرے لوگ بیان کرتے ہیں اور جن
کی کہانیاں قومی فخر کا موجب ہیں۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز جو ہمیں
اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ ہم ان چند لوگوں کی کہانیاں بیاں کریں۔
بعض فطری ودیعتوں یا نقائص کے نشوونما اور زندگی میں انکے استعمال
کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ کچھ خاص اخلاقی ودیعتیں کسی شخص کو ایک اخلاقی
شخصیت بنانے کے لئے کافی ہیں۔ اور ہمارے سامنے ایسے بہت سے
لوگ آتے ہیں۔ جن کے اخلاق ہمیں متاثر کرتے ہیں۔
ان اخلاقی اوصاف کے ذریعے جو انھیں فطرت کی طرف سے
ملے ہیں وہ خوب پروان چڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ دوسروں
میں ممتاز ہو جاتے ہیں۔ اُن کے اعمال ان کے وضع کردہ اصولوں کے
مطابق ہوتے ہیں۔ انھیں کسی کتاب، آدرش یا نصیحت کا محتاج ہونے
کی ضرورت نہیں۔ اُن کا ضمیر ان کی رہنمائی کرتا ہے اور ان کے وضع
کردہ اصول لاٹھی بن کر انھیں سہارا دیتے ہیں۔ ان کے اصول اکثر ان کی
اپنی تخلیق ہوتے ہیں اور ان کا راستہ مانگی تانگی کرنوں سے نہیں بلکہ
خود ان کے ذہن سے طلوع ہونے والے سورج سے روشن ہوتا ہے۔

یہ اخلاقی شخصیتیں ہیں۔

اب پیغمبر، مذہبی رہنما اور فلسفہ دان کو لیجئے۔ وہ دنیا کو عام لوگوں کی طرح نہیں دیکھتے۔ بلکہ اُن کا نقطۂ نگاہ منفرد ہوتا ہے۔ ان کی باتیں مروجہ مفروضات سے ذرا ہٹ کر ہوتی ہیں۔ عام آدمی کا ذہن ان باتوں سے حیران ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے ذہن میں بالکل اور ہی باتیں موجود ہیں۔

ایسے لوگوں کو جو زندگی کے متعلق قنوطی رویہ رکھتے ہوں قنوطیت پسند کہا جائے گا۔ ورنہ یاس پسند۔ یہ لوگ اپنی افتادِ طبع کے مطابق غور و فکر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ان کے معتقدات کی منطق خود اپنی وضع کردہ ہوتی ہے۔ جس کے سبب اُن کی ذہانت اور خلوص ان کے اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے قول اور عمل میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔

دوسروں کی کہانی کے اجزا تو ہم نے دیکھ لئے۔ مگر کیا یہ اجزا ہماری زندگی میں بھی موجود ہیں؟ اس کے لئے غور و فکر کی ضرورت ہے

اگر ہم میں سے ایک شخص لکیریں کھینچنے کی طرف مائل ہے۔ اور ڈرائنگ سے دلچسپی رکھتا ہے تو تھوڑی سی محنت اور زندگی کے مختلف زاویوں کے مطالعہ سے ایک آرٹسٹ بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں یہ یہ خاصیتیں موجود ہوں۔ اور وہ اپنے تاثر کو انفرادی ڈھنگ میں ظاہر کر سکتا ہو۔

یہی حال ہمارے ادبی شوق کا ہے ۔ کتابوں کا کیڑا بننے سے
ہم ادیب نہیں بن سکتے ۔ بلکہ ادیب وہ ہے جو زندگی کو اپنے ہی زاویہ
نگاہ سے دیکھے اور اپنی انفرادی سوچ بچار اور محسوسات سے
پڑھنے والوں میں بھی اسی قسم کے تاثرات پیدا کرے ۔
سائنس کے میدان میں یہی انفرادیت ہمیں ایجادات کی طرف
لے جائے گی
یہ تو ذہن کے بارے میں تھا ۔ جسم کا بھی یہی حال ہے ۔ اگر ہم اس
طرف توجہ دیں اور اپنے بدن کی نشو و نما کے لئے کھیلوں میں حصہ لیں
تو اس میدان میں بھی شخصیت بن سکتی ہے ۔ قدرت نے کسی کو
مضبوط جسم دیا ہو تو وہ استقلال اور مشق سے کھیلوں میں نام پیدا
کر سکتا ہے ۔ ہمارے ایک ادیب کی کہانی اتنی ہی دلچسپ ہے جتنی ٹینس
کے ایک چیمپین کی ۔

بڑے لوگوں میں بھی کچھ لوگ منفرد شخصیت کے مالک ہوتے ہیں
جہاں اُن کا ذکر ہوا ہم کان دھر کے سننے لگتے ہیں ۔ اُن کے جرائم
کی روئیداد اور اُن کے حیران کن کارنامے لمبی چوڑی داستانیں
بن کر ہمارے بیچ گھومتی رہتی ہیں ۔ ہم دانتوں میں انگلیاں دبا کر انھیں
سنتے ہیں ۔ اور ذہن ہی ذہن میں ان کا سراپا کھڑا کر لیتے ہیں ۔ وہ
بُرے سہی لیکن اُن کی بُرائی ایک کمالِ فن کی حامل ہوتی ہے ۔ اور وہی

فن انھیں سب میں نمایاں کرتا ہے۔

بادشاہ یا نواب کی بات اور ہے۔ اُن کی شخصیت وراثتی نوعیت کی ہوتی ہے۔ باپ کی موت پر بیٹا تخت سنبھال لیتا ہے اور اسی طرح یہ کڑی لمبی ہو جاتی ہے۔ ہاں کسی بادشاہ میں کوئی اور وصف ہو تو یہ اس کی اپنی کاشت ہے۔ اس کی شخصیت میں ایک اضافہ کوئی شعر کہنے لگے یا فن کار بن جائے تو اس کی شخصیت ایک چھوڑ دو ستونوں پر کھڑی نظر آتی ہے۔

شخصیت کی بعض خصوصیات

کبھی کبھی ہمیں زندگی بالکل سوکھی پھیکی معلوم ہونے لگتی ہے اور ہم مایوس ہوکر دوسروں کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ آخر ہم میں کون سی کمی ہے اور کون اجزا الٹے سیدھے ہیں آیئے ذرا اس کا جائزہ لیں۔

ہر انسان جو اس دنیا میں پیدا ہوا ہے ایک کہانی ہے اور یہ دنیا کہانیوں کا ایک مجموعہ۔ ہر شخص دنیا کے نظام میں ایک پرزہ کی طرح کام کرتا ہے۔ اگر ہم اس پرزے کی اصل قدر و قیمت کو پالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ دیکھنے میں وہ ایک معمولی سی مگر کام کے اعتبار سے بہت اہم چیز ہے جو شخص اپنی اس قدر و قیمت کو پہچان لے۔ وہ کہانی کا کامیاب کردار بن جاتا ہے۔ یہ قدر و قیمت کیا ہے؟ یہی اپنے ضمیر کو اچھی طرح سمجھنا۔ جب ہم اسے پاگئے۔ سمجھو ہمیں انسانیت کی اصل ماہیت معلوم ہوگئی۔ اور وہ تمام مخفی راز جو قدرت نے ہمارے اندر پوشیدہ کررکھے ہیں۔ افشا ہوگئے ان رازوں کا پالینا ہی کامیابی کا زینہ ہے۔

اس کامیابی کو حاصل کرنے کے بعد ہم میں وہ جوہر پیدا ہوتے ہیں ۔ جن سے دوسرے لوگ ہمیں محبت کرنے لگتے ہیں ۔ ہماری ذات میں ایک کشش پیدا ہو جاتی ہے ۔ اور یہ کشش نتیجہ ہوتی ہے مسلسل دانائی سے کام کرنے کا ۔

شخصیت کوئی ایسی چیز نہیں جو آسمان سے اتر کر آئے اور ہم اس کے تابع کام کرنے لگیں ۔ بلکہ یہ ایک فطری جوہر ہے جو ہمارے اندر پوشیدہ رہتا ہے جسے بروئے کار لانے کے لئے ہمیں تگ و دو کرنا پڑتی ہے ۔ اس کے بعد کہیں جا کر شخصیت کے اجزا مجتمع ہو کر زندگی اختیار کرتے ہیں اور ہماری بناوٹ پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں ۔

مثال کے طور پر سونے کو لیجئے ۔ یہ زمین کے سینے میں دفن ہوتا ہے لیکن اس کی حالت ویسی نہیں ہوتی جس حالت میں ہم اسے بازار سے خریدتے ہیں ۔ اس کے زرد زرد ذرات ریت میں بکھرے ہوتے ہیں یا دریا کی تہہ میں بہتے ہیں ۔ انھیں جمع کرنا بڑا مشکل کام ہے ۔ جس کے لئے مستعدی اور استقلال کی ضرورت ہے ۔

اسی طرح اپنی ذات میں کشش پیدا کرنے کے لئے ذرات کو ریت سے علیحدہ کرنا پڑے گا ۔ یہ کام ذرا احتیاط چاہتا ہے ۔ مستعدی اور چستی اس کا لازمی جزو ہیں ۔ سونا تلاش کر لینا آسان ہے ۔ مگر اپنے آپکو جاننا بہت ہی مشکل کام ہے ۔ دماغ سوچتا ہے تو ہم عمل کرتے ہیں ۔ لیکن دماغ وہی کچھ سوچتا ہے جو ہمارا ضمیر کہتا ہے ۔ یہی ضمیر ہماری ذات ہے ۔

اسے سمجھنا آسان نہیں۔ بلکہ زندگی کا مشکل ترین کام ہے۔ اس مشکل کام کو سرانجام دینے کے لئے سب سے پہلا قدم اخلاص ہے ورنہ ہم چوک جائیں گے۔ ہمیں اپنی قدر معلوم نہ ہو سکے گی اخلاص وہ نور ہے جو زندگی کے اندھیروں میں ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔

اخلاص پہلا زینہ تھا۔ اور ہماری کہانی کی پہلی کڑی۔ اس کے بعد دوسرا زینہ اور دوسری کڑی" قوت فیصلہ" ہے۔ جب نور نے ہمیں راستہ دکھایا تو ہمیں اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ کہ زندگی کے بے شمار راستوں اور پگڈنڈیوں میں وہ کونسا سیدھا راستہ ہے جو منزل مقصود تک ہماری رہنمائی کر سکے گا۔

اب ہم ذرا آگے بڑھتے ہیں راستہ نظر آنے لگا ہے۔ ہم نے اپنا صحیح راستہ منتخب کر لیا۔ کہانی کا آغاز ہو چکا ہے' اب سننے والے منتظر ہیں کہ اس کے آگے کیا ہوگا۔ پھر ہمارا کام یہ ہے کہ ہم سننے والوں کو کہانی میں محو رکھیں۔ ہمارا ایک ایک لفظ اُن کے دل و دماغ میں اتر جائے۔ اس میں اثر ہو۔ ہماری کہانی اگر طربیہ ہے تو سننے والے خوش ہوں۔ اگر المیہ ہے تو وہ رو دیں۔

جب یہ حالت پیدا ہو جائے تو سمجھئیے کہ آپ کی شخصیت تکمیل کی طرف جا رہی ہے۔

یہ راہ پر خطر ہے۔ اندھیری رات اور لق و دق صحرا میں چاروں طرف سے ہیبت ناک آوازیں آ رہی ہیں۔ جو ہمت کو کم کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن ہمیں ان سب کا مقابلہ کرنا ہے۔ جو شخص خوف اور ان آوازوں سے مرعوب ہو گیا۔

اس نے گویا عزت، شہرت اور دولت کی دیوی کو ہاتھ سے دیدیا۔

یہ آواز بڑی خطرناک ہے۔ ترقی کی راہ میں ایک روک ہے اس کا علاج یہی ہے کہ ہم دوسروں کی قدر کریں۔ ہم پر یہ آواز جس کا دوسرا نام غرور ہے۔ اپنا اثر نہ کر سکے۔

ہم منزل پر گامزن ہیں اور کہانی سننے والے ہمارے منتظر ہیں۔ اگر ہم میں کوئی جوشیلی بات نہیں تو سننے والے مایوس ہوں گے۔ بھلا یہ کیسی کہانی اخلاص کے زینے پر اگر قدم رک گیا تو کیا فائدہ، فائدہ تھا تو اسی میں کہ قدم بڑھتا چلے۔ یہاں تک کہ کہانی سننے والوں کے قدم بھی خود بخود ہمارے ساتھ اٹھنے لگیں۔ ہمت اور قوت ہمارا سہارا ہوں۔ کوئی مشکل ہمارے قدموں کو لڑکھڑا نہ سکے۔ ذرا بھی قدم ڈگمگایا تو ہم اندھیرے غاروں میں گر پڑیں گے اور ہمارا ٹھکانہ تاریکیوں میں ہوگا۔ خوف کو اپنے پاس نہ آنے دیں۔ مردانہ وار ہم حوادث کا مقابلہ کریں۔ اگر ہم میں یہ صفات پیدا ہو جائیں تو ہماری کہانی کتنی دلچسپ ہوگی۔ سننے والے ہماری تعریف کریں گے۔

ہمت کے لئے عزم کی ضرورت ہے۔ عزم امتحان چاہتا ہے۔ ہمارے سامنے دو بُرائیاں ہیں۔ ادنیٰ بُرائی ہم نے اختیار کر لی۔ لیکن بڑی بُرائی سے بچنے کے لئے ہم جان جوکھم میں ڈال دیتے ہیں اور اپنے عزم اور اپنی ہمت کا سہارا لے کر اس سے بچ نکلتے ہیں۔ خیالات پریشان ہیں بڑی خواہشات ہمارے اندر ایک ہیجان سا پیدا کئے ہیں۔ لیکن ہم عزم ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ باہر سخت سردی ہے۔ لیکن ہم ٹھنڈے پانی سے

چاہتے ہیں۔ یہ ہمارا عزم ہے ہمارا ہاتھ زخمی ہو جاتا ہے اور اسی پر عمل جراحی ہوتا ہے لیکن ہم ہنسی ہنسی درد برداشت کر لیتے ہیں اور سی تک نہیں کرتے ہیں یہ بھی ایک عزم ہے۔

اپنی کمزوریوں کا اقرار بے خوفی سے کرنے سے ہماری قدر بڑھ جاتی ہے۔ پھر جب ہم عزم کر لیتے ہیں کہ یہ کمزوریاں دوبارہ رونما نہ ہونگی، تو اس سے ہماری قوت بڑھ جاتی ہے اور ہم زندگی کے مشکل مقامات سے بچ جاتے ہیں۔ یہ اخلاقی جرأت ہے۔ ہماری ذات کی نشو و نما کا ایک اور زینہ۔ ہماری کہانی کا دلچسپ حصہ۔

ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ باغبان کسی پودے کا بیج بونے کے بعد ہر روز اُسے آن کر دیکھتا ہے ایک ایک دن کا تغیر اس کی نظر میں ہوتا ہے اور وہ اُسے زیادہ سے زیادہ خوش نما بنانے کے لئے اس کی نشو و نما میں طرح طرح کے طریقے استعمال کرتا ہے۔

یہی حال ہمارا ہے۔ ہمارے اندر کئی خوشنما پودوں کے بیج ہیں ہم جس قدر احتیاط سے اُن کی نشو و نما کریں گے اسی قدر وہ پھلیں پھولیں گے اور پھر اپنے پودوں کے رنگ و بو کا موازنہ دوسرے لوگوں کے پودوں سے کرتے رہیں گے۔ تو ہماری اپنی صفات اور دوسروں کی صفات ہمارے سامنے رہیں گی۔ اور ہم اپنے اندر حسن و قبح کو جانچ سکیں گے۔

اگر کوئی باغبان گلاب کے پودے بو کر دوسرے باغبان کے

پودوں کو حسد کی نگاہ سے تکنے لگے تو اس کے پودے کبھی بھی پنپ سکیں گے؟
ایسا ممکن ہی نہیں۔ بلکہ خود اُس کے پودے اس کی بے توجہی کی وجہ سے
سوکھ سڑ جائیں گے۔ اُسے تو چاہئے کہ اپنے پودوں کی پوری دیکھ بھال
کرے۔ اگر دوسرے باغبان کے پودے زیادہ اچھے اُگ رہے ہیں تو
وہ ذرائع معلوم کرے جس سے دوسرا باغبان پودوں کی پرورش کر رہا ہے
اسی طرح اس کے دل میں حسد اور نفرت کی بجائے اپنے ہم پیشہ بھائی
کے لئے جذبہ الفت پیدا ہوگا۔ اس کے ساتھ اس کے اپنے پودے
زیادہ پھولدار ہوں گے۔ اس کی محنت بارآور ہوگی۔

حسد ایک گھن ہے جو شخصیت کے خوشنما پھول دار پودے کو
کھا کر راکھ کر دیتا ہے۔ دوسروں کی کمزوریوں پر حسد سے نکتہ چینی کرنا ہمیں
معزز بنا دے گا۔؟ ہرگز، ہرگز نہیں — بلکہ ہم تو زیادہ قابل نفرت
ہوں گے۔ کون ہمیں محبت کرے گا۔ دوسرے ہم سے دور بھاگیں گے۔
حسد، بغض، عداوت یہ وہ ڈراؤنی آوازیں ہیں جو ہمیں منزل مقصود سے
بھٹکانے کے لئے تاریک رات میں سنائی دیتی ہیں یہ بُری روحوں کی
کرخت اور مہیب آوازیں ہیں۔

باغبان کی طرح مختلف پودوں کے بیج لے کر انھیں بوئیے۔ پھر
ان کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔ بیج سے پودے بننے اور اس میں پھول
اور پھل آنے تک کئی منازل ہیں۔ جس کے لئے ہمیں مستعدی، استقلال
عزم، ہمت اور اخلاص سے کام لینا ہوگا۔ اس کے بعد جب باغ پھولوں

اور پھلوں سے بھر گیا۔ تو لوگ خود بخود اسے دیکھنے لگیں گے۔ پھولوں کے رنگ ان کی آنکھوں میں ایک نیا نور پیدا کریں گے۔ خوشبو اُن کے دماغ معطر کرے گی۔ اور پھل اُن کے جسم میں قوت پیدا کریں گے۔

ہماری زندگی کی کہانی جب ایک ایسا ہی باغ بن جائے جہاں چاروں طرف پھول اور پھل ہوں تو لوگ جھوم جھوم کر اسے سننے لگیں گے۔

بالغ نظری

لوگ ہمارے متعلق کیا کہتے ہیں؟ یہ ایک ایسا خیال ہے جس سے چھٹکارا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ لوگوں کا کہنا ایک ایسی عدالت کا فیصلہ ہے۔ جس میں پیش ہونے والا ہر انسان ملزم نہیں بلکہ مجرم کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔

یہ ایک عام دستور ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی تعریف ذرا کم ہی کرتے ہیں۔ دوسروں کے اعمال، خیالات اور کردار کی تحسین کرنے کو ان کا جی نہیں چاہتا۔ اس کا باعث یہ ہے کہ ہم نے چند ذاتی آراء تیار کر رکھی ہیں۔ جن میں تعصب، ناانصافی اور خود پسندی کو کافی دخل ہوتا ہے۔

لوگوں کی عدالت میں صفائی پیش کرنا مشکل کام ہے۔ کیونکہ عدالت کے فیصلے میں حسد کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ یہ جذبہ ایک عالمگیر جذبہ ہے۔ جو انسانیت کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ ایسی عدالت میں

جب مقدمہ پیش ہو تو پھر صفائی پیش کرنے کے لئے بہت زیادہ احتیاط اور ڈھنگ کی ضرورت ہے۔

زندگی بسر کرنے کے لئے ایک خاص سیاست کی ضرورت ہے۔ ایک ایسا ڈھب جاننا ضروری ہے جس سے ہم زمانے کے سرد و گرم میں محفوظ رہ سکیں۔ اس کے لئے سب سے اچھا طریق یہ ہے۔ کہ ہم اُن خواہشات کو جو کسی کی روح پر حاوی ہو رہی ہوں۔ شاطرانہ طور پر منظور نظر بنانے کی کوشش کریں۔ اگر کوئی جسمانی طور پر معذور ہے۔ تو ہم اس سے ہمدردی کا سلوک کریں۔ اس ذریعے سے ہمارا دوسروں پر اچھا اثر ہوگا۔ اور ہم دوسروں کے دلوں میں جگہ پیدا کر سکیں گے۔ اس طرح لوگ ہم پر نکتہ چینی کرنے کی بجائے ہمارے گرویدہ ہو جائیں گے۔

زندگی ایک رزم گاہ ہے۔ جہاں ہر ایک برسر پیکار ہے۔ اس جدوجہد اور حالات کا ہر ایک کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کتنے ہیں جو اس میں فتحمند ہوتے ہیں۔ اور جو ہوتے ہیں اُن کی کہانی بیان کرتے ہوئے ہم اپنے اندر ایک نئی قوت پاتے ہیں۔ اس جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع معلوم کئے جا چکے ہیں۔ مگر ان میں سب سے موثر ذریعہ مصلحت کوشی ہے۔ مصلحت کوشی ایک ایسا فن ہے جس سے خطرات سے بچاؤ ہو سکتا ہے۔ ہمارے دل میں یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خطرہ موجود نہیں تو اُس سے بچاؤ کی فکر بے معنی ہے۔ ہم کسی سڑک پر دن کی روشنی میں چلے جا رہے ہیں ایسے میں خواہ مخواہ خطرے کا احساس درست ہوگا؟

سوال معقول ہے۔ اگر ہم سڑک پر کسی بے فکرے کی طرح انجام سے لاپروا چلتے جائیں۔ تو ممکن ہے کوئی خطرہ پیش آجائے۔ اس لئے مصلحت کوشی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم حفظ ماتقدم کی خاطر احتیاط کا دامن تھام لیں۔ احتیاط مصلحت اندیشی کا ایک جزو ہے۔ اہم جزو۔

احتیاط کا جائز استعمال زندگی کی ڈور میں ایک ایسا وسیلہ ہے جس سے یقین اور کامرانی پیدا ہوتے ہیں

زندگی کو ہم نے ایک رزم گاہ کہا ہے۔ آئیے ذرا اس کا جائزہ تو لیں شام کا وقت ہے۔ صبح حملہ کی تیاری ہوگی۔ اس لئے کہ رات دشمن کی فوجوں نے میدان میں پڑاؤ ڈال دیئے۔ خیمے استادہ ہونے لگے۔ کیا ان خیموں کے گرد پہرہ دار مقرر کردینے سے کام چل جائیگا؟ ہرگز نہیں بلکہ دشمن کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لئے جاسوس بھیجنے ہوں گے۔ میدانِ جنگ کے مختلف محاذوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ تاکہ حملے میں آسانی رہے۔

مصلحت اندیشی ایسا خیمہ ہے جس کے گرد مضبوط پہرہ دار کھڑے ہیں۔ اس خیمے کے اندر ہر سپاہی کیل کانٹے سے لیس مدافعت کے لئے موجود ہے۔ احتیاط کا کام جاسوس روانہ کرنا ہے تاکہ وہ رات کی تاریکی میں جنگل اور چھپنے کے مقامات کو ڈھونڈیں وہ چاروں طرف پھیل جائیں اور جہاں کہیں ممکن ہو دشمن کی تلاش کریں۔

خطرے کا احساس نفع بخش احتیاط ہے۔ لیکن اگر احتیاط حدِ اعتدال سے بڑھ جائے، تو وہ ہمارے اندر کمزوری پیدا کردے گی۔ ہمارا ذہن کام

کرتے ہوئے خوف محسوس کرے گا۔ اس لئے میانہ روی کو کبھی ہاتھ سے
جانے نہ دیجئے۔ محتاط اس حد تک رہیں جس حد تک کہ ہماری احتیاط ظاہر
نہ ہو۔ ورنہ لوگ اسے ہماری کمزوری اور خود ناعتمادی پر محمول کریں گے۔

اپنے بیان کو ذرا واضح کرنے کے لئے ہم ایک مثال بیان کرتے ہیں
فرض کیجئے کہ آپ کی آواز میں لوچ ہے۔ مٹھاس اور سوز مل کر اُسے
خوبصورت بنا دیتے ہیں۔ اگر آپ راگ جانتے ہوں۔ تو آپ کا نام لوگوں
کے لئے کہانی بن سکتا ہے۔ آپ کے گزرنے پر لوگ آپ کو ایک موسیقار
جان کر آپ کی عزت کر سکتے ہیں۔ آپ گاتے ہیں۔ محض شوق پورا کرنے کیلئے
ایک دوست مشورہ دیتا ہے کہ فلاں ماہر موسیقی کے سامنے زانوئے ادب
تہ کیجئے۔ تاکہ آپ بھی اس فن میں کمال حاصل کر سکیں۔ یہ شوق ایک فن
بن جائے اور فن کے ذریعے آپ کا نام روشن ہو۔ یہ سب کچھ درست۔ مگر
ماہر موسیقی راگ سکھانے کے لئے معقول معاوضہ مانگتا ہے۔

مصلحت کوشی سوچتی ہے۔ جو کچھ فیصلہ کرنا ہے ذرا دھیرج سے،
سوچ بچار کے بعد حالات کا جائزہ لے کر، ذرا اپنی ودلعیت کو بھی تو جانچو۔
کیا تم میں اس کے لئے استعداد موجود ہے؟ اس کے لئے معاوضہ؟ کیا ماہر فن
خود قابل اعتماد ہے؟

احتیاط ذرا زیادہ تیز ہے اور وہ نتائج اخذ کرنے میں جلد بازی سے
کام لیا کرتی ہے۔ اس کے سامنے خطرات کا احساس رہتا ہے ——
میاں! ذرا معلوم تو کرلو کہ تم سے معاوضہ دہی طلب کیا گیا ہے جو دوسرے

دیتے ہیں۔ کہیں تمھیں بنایا تو نہیں جا رہا ہے۔ راگی کو ذرا نزدیک سے دیکھو تو ــــ اس میں کوئی کمال بھی ہے کہ یونہی یار لوگوں نے ہوا باندھ رکھی ہے۔ اگر وہ قابل اعتماد ہے تو اس کی فنکارانہ طبیعت کو بھی تو پرکھ دیکھو۔ جلدی کیا ہے ؟ راگ کہیں بھاگ تھوڑا جائے گا۔ اطمینان کے بعد کام شروع کیا جا سکتا ہے۔

مصلحت کوشی اور احتیاط نے معاملے کے سارے پہلو ہمارے سامنے لا رکھے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہم پہلے ایک عمل کریں اور پھر اپنی غلطی کو محسوس کر کے پچھتائیں۔ یہ اچھا ہے کہ عمل سے پہلے سوچ لیا جائے۔ سوچ کے بعد نتیجہ اخذ کر لینا زیادہ آسان اور صحیح ہوگا۔

موسیقار کے بارے میں آپ نے معلومات آخر لوگوں سے ہی حاصل کی ہوں گی۔ لیکن اُن میں سے کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ آپ نے کیوں یہ دریافت کیا ہے۔ موسیقار کو بھی کبھی اس بات کا علم نہیں ہوگا کہ اس بارے میں اتنی چھان بین کی گئی ہے۔

اس چھان بین کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ آپ اطمینان سے اپنی تعلیم لے سکیں گے آپ کو اپنے استاد کے متعلق پوری معلومات ہوں گی۔ اس لئے آپ اُن سے فائدہ اٹھا کر موسیقی کو جلد سیکھ لیں گے۔

احتیاط کی دوسری مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ خام لوہے کا ایک ٹکڑہ زنگ اور مٹی سے آلودہ ہوتا ہے۔ اسے صاف کرنے کے لئے بھٹی میں ڈالا جاتا ہے۔ جب لوہا سرخ ہو جائے تو پھر زنگ اور مٹی کو دور کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد خالص لوہا بنتا ہے۔

یہی حال احتیاط کا ہے۔ موسیقار کی قابلیت کو پرکھنے کے لئے آپ نے
اس کے گرد شک وشبہ کا ایک جال بن دیا ہے۔ جب اس جال کے تار
آہستہ آہستہ سلجھائے گئے تو سارا زنگ اور گرد دور ہوتی گئی۔ اندر سے
موسیقار کے اصل جوہر نمایاں ہونے لگے۔ آپ کی مصلحت کوشی اور دوربینی
نے ایک فنکار کو اس کے اصل مقام پر دیکھا ہے۔

یہ احتیاط کا صحیح پہلو ہے۔ احتیاط مصلحت کوشی کی رہنمائی اسی حالت
میں کر سکتی ہے جب وہ میانہ روی پر قدم زن رہے۔ اگر احتیاط ہمیشہ بُرا پہلو
ہی دیکھنے لگے تو نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔

کسی کو پرکھنے کے لئے اُسے مشتبہ نگاہ سے دیکھنا بُرا نہیں۔ بشرطیکہ
آپ کے مدنظر اس کی اچھائیاں معلوم کرنا ہو۔ اگر آپ کے ذہن میں یہ خیال ہے
کہ اُس کی برائیاں ڈھونڈھ نکالی جائیں تو یہ احتیاط کا تاریک پہلو ہے۔ غیر مفید نہیں،
نقصان رساں، یہ مصلحت اندیشی نہیں کوتاہ بینی ہے۔

احتیاط، اعتماد اور شک وظن کا درمیانی راستہ ہے۔

یہ ایک انسانی کمزوری ہے کہ وہ دوسروں کی کمزوری سے فائدہ
اٹھاتا ہے ایک دن کا خیال ہے کہ ہمیں کبھی اپنی جانی بوجھی چیزوں کو دوسروں
تک نہ جانے دینا چاہئے کیونکہ وہ اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے۔
یہ خیال کہاں تک درست ہے؟ اس کا جواب تو حالات ہی دے سکتے ہیں۔

اگر آپ کو اس بات کا مطلقاً کوئی خوف نہیں کہ کوئی آپ کی کمزوری
سے فائدہ اٹھائے گا تو بھی آپ دوسروں کے حسد کی آگ سے اپنا دامن بچائیے

رکھیں۔ یہ آگ آپ کے خوبصورت سراپا کو اگر جلا نہ سکی تو جھلس ضرور دے گی۔
اس سے بچنا ضروری ہے۔

اکثر ایسا ہوا کہ دو عزیز دوستوں میں جب حسد کی آگ سلگنے لگی تو
ان کی برسوں کی دوستی چند دنوں میں جل کر راکھ ہو گئی۔ چنانچہ ایک بار ایسا
ہوا کہ دو مصور دوست برسوں سے اکٹھے کام کر رہے تھے۔ اُن میں سے
ایک کو اتفاقاً اچھا کام مل گیا۔ ایک امیر جوان کو اس کی تصویریں پسند آ گئیں
قسمت اس پر مسکرانے لگی۔

اس نے یہ خوش خبری اپنے جگری دوست کو سنائی۔ اُسکا خیال
تھا کہ وہ سن کر خوش ہو گا۔ مگر ہوا اس کے برعکس، وہ دوست حسد کرنے لگا۔
اس کے دل میں چنگاری سلگنے لگی۔

کامیاب مصور نے اپنی تصویریں مکمل کر کے انھیں امیر کو پیش کرنے
کے لئے سجا دیا۔ وہ خوش تھا۔ اس کے انداز میں فخر کی جھلکی نمودار ہو رہی تھی
یہ انداز حاسد کے دل پر زخم لگانے لگا۔

رات آئی کامیاب مصور خوشی سے اس قدر جوش میں تھا کہ اُسے
نیند نہ آئی۔ اس کا ساتھی بھی جاگ رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک آگ
بھڑک اٹھی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کی نیند حرام ہو گئی۔ مگر وہ سونے کا
بہانہ کر کے خراٹے لینے لگا۔

حاسد کی قوت برداشت نے جواب دے دیا۔ وہ آہستہ سے اٹھا۔
ادھر ادھر دیکھا اور دبے پاؤں کمرے سے باہر روانہ ہوا اس کا ساتھی

حیران تھا کہ اس کا دوست کدھر جا رہا ہے۔ وہ بھی اس کا تعاقب کرنے لگا
پہلا دوست تاریک نگار خانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ دروازے کی
اوٹ میں چھپ گیا۔

حاسد سب سے اچھی تصویر کے قریب پہنچا۔ اُسے اٹھا کر وہ کھڑکی کے
قریب لے گیا۔ اور چاند کی روشنی میں اسے دیکھنے لگا اس کے دل کی کیفیت
اس کے چہرے سے عیاں ہو رہی تھی۔ یکایک وہ مڑا اور رنگوں کا برش اٹھایا۔ اسکا
دوست ساری بات سمجھ گیا۔ بے اختیار اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ بھاگتا
ہوا اپنے کمرے میں لوٹا اور بستر پر دراز ہو گیا۔

مجرم دوست کا ہاتھ رک گیا۔ وہ بھی کمرے میں آ گیا۔ اس کا ضمیر اُسے
ملامت کر رہا تھا:

"معاف کرنا دوست میں اندھا ہو گیا تھا ——"

مگر دوسرے دوست نے اپنے آپ پر قابو پا لیا تھا۔ اس نے کروٹ لی۔ گویا وہ
ابھی تک خواب میں تھا۔

"کیا گیا؟" اس نے آنکھیں کھولیں۔

"تم نے چیخ ماری تھی؟ میں تو صرف ——" اس کی زبان رک گئی

"میں نے چیخ ماری؟ —— کب ——؟ میں تو سو رہا تھا۔ تم نے یونہی
جگا دیا۔"

حاسد نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کا دل ہلکا ہو چکا تھا۔ وہ بستر پر
دراز ہوتے ہی خراٹے لینے لگا۔ دوسرا دوست پھر اٹھا۔ وہ نگار خانہ میں گیا

اور تصویروں کو اکٹھا کر کے محفوظ جگہ میں بند کر دیا۔ دوسرے دن علی الصبح جبکہ اس کا دوست ابھی تک سو رہا تھا۔ اُس نے تصاویر کو امیر کے ہاں پہنچا کر ہی دم لیا۔

یہ فطرت انسانی کی کمزوری کی ایک تصویر ہے۔ عقل مند مصور نے مصلحت اندیشی سے کام لے کر دوست کی کمزوری کو چھپا دیا۔ اس کا شہ پارا بھی بچ گیا۔ ورنہ اگر وہ ذرا بھی تلخی سے کام لیتا تو شاید حاسد کے دل کی آگ ساری تصویروں کو جلا کر راکھ کر دیتی۔

مصور نے اپنے جگری دوست کی حرکات پر شبہہ کیا پھر اُس کا اُپاؤ ڈھونڈا۔ اگر ہم کسی دوسرے کی کمزوری جان لیں تو اس سے وہ دشمن نہیں بن جاتا۔ بلکہ صحیح طریق یہ ہے کہ اس کے نقصان پہنچانے سے پہلے ہی آپ پیش بندی کر لیں۔ شور مچا کر بات کا تبنگڑ بنانا مفید نہ ہوگا۔ احتیاط سے کام لیں۔ اور نہایت ذہانت سے حاسد کی نیش زنی کا وار خالی جانے دیں

دوستی کے درمیان حسد ایک سیسہ کی دیوار بن جاتی ہے۔ اس دیوار سے دور رہنا ضروری ہے۔ شاید دیوار گر کر کسی کو دبا لے۔ کسی کو کیا؟ آپ ہی نہ دب جائیں۔

ہم میں سے جو ذرا آگے بڑھا اس کے حاسد پیدا ہو نے لگے۔ انسان دوسرے کو بڑھتے نہیں دیکھ سکتا۔ جس نے بڑھنے کی کوشش کی۔ اس کی راہ میں روک ڈالنے والے بھی موجود رہتے ہیں۔ یہ ہماری کمزوری ہے۔

ایسے حالات میں ہمیں سکون اور تدبر سے کام لینا ہوگا۔ ٹھنڈے دل سے حالات پر غور کرنا ہوگا۔ جب کسی دشمن کو علم ہو جائے کہ اس کی چالیں ناکام ہوگئی ہیں تو اس کی دشمنی بڑھ جاتی ہے اور وہ کھسیانا ہو کر کھمبا نوچنے لگتا ہے۔

بڑا آدمی بننے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے کی باتیں سن کر بھی چشم پوشی کی جائے۔ بلکہ اُن سے ایسا سلوک روا رکھا جائے جس سے وہ حسد کی بجائے ہم سے رشک کرنے لگیں اور یہ رشک پھر محبت میں بدل جائے۔ یہ آسان کام نہیں۔ اس کے لیے آپ اپنے آپ پر جبر کی ضرورت ہے۔ جب ہم نے یہ مقام حاصل کر لیا تو پھر ہر کوئی ہمارا گرویدہ ہوگا۔ ہماری کہانی بیان کی جانے لگے گی۔

شخصیت کی تکمیل کے لیے یہ پہلو ازحد لازمی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ زندگی پر لوگوں کا قابو نہیں ہوتا بلکہ ان کی آرزوئیں زندگی کو اپنے ڈھب پر لاتی ہیں۔

ایک فلسفی کا کہنا کتنا صحیح ہے کہ "انسانی خواہشات ہی ہماری زندگی میں حرکت پیدا کرتی ہیں۔ ہم اپنے اردگرد جو اچھی یا بُری باتیں دیکھتے ہیں وہ انھیں کا نتیجہ ہیں۔ ان کا اثر ہماری ذہانت اور ہمارے ارادے پر بھی ہوتا ہے۔"

صرف اسی قدر نہیں بلکہ اسی فلسفی کے نزدیک ہماری خودی اور خود پسندی ہی تمام انسانی جذبات کی محرک ہیں۔ رشک اور حسد انھیں

جذبات کی پیداوار ہیں۔ ان کا اثر زندگی کے ہر دور اور ہر شے پر نمایاں ہوتا ہے۔ حسد سے بڑھ کر انسانیت کا اور کوئی دشمن نہیں اس سے بچے رہنا ہی زندگی کا کمال ہے

ہمارے چاروں طرف بارود کے گڑھے ہیں۔ انھیں حسد کی ذرا سی چنگاری شعلہ بنا دے گی۔ یہ شعلہ کہیں آپ کو جلا نہ دے۔ اس لئے بڑا بننے کا گُر یہی ہے کہ دوسروں کے جذبات کو کبھی مجروح نہ ہونے دیا جائے۔ تاکہ یہ چنگاری پیدا ہی نہ ہو۔

جدّت پسندی

اگر ہم میں سے کسی کو یہ علم ہو جائے کہ اس کی کہانی دوسرے خوشی سے بیان کرتے اور سنتے ہیں، تو اسے نخوت اور غرور سے بچنا چاہیے۔ کیونکہ ترقی کی راہ میں یہ ایک روک ہے جہاں دوسرے حسد سے جلتے ہیں۔ وہاں ہم غرور سے حقیر ہونے لگتے ہیں۔ خود اعتمادی ایک جوہر ہے۔ جس سے ہم دوسروں کو اپنا سکتے ہیں۔ مگر اس میں حد سے تجاوز نقصان کا موجب ہوتا ہے۔ اگر قدرت نے ہمیں ایک نعمت دی ہے۔ جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بھائیوں کو متاثر کر سکتے ہیں تو ہمیں اس نعمت کے لئے شکر کرنا چاہئے۔ نہ کہ ہمارا دماغ خراب ہونے لگے۔ ہم آپے سے باہر ہو جائیں۔ تکبر اور نخوت کانٹے ہیں جو ہم خود اپنی راہ میں بوتے ہیں۔

اپنی قابلیت اور قدر و قیمت کا بڑھ چڑھ کر اندازہ لگانا ایک تباہی مول لینا ہے۔ ہمارے لئے یہی بہتر ہے کہ ہم یہ اندازہ ذرا کم ہی کریں۔ تاکہ ہماری ترقی کے امکانات پیدا ہوں۔ غرور کو اگر دبا لیا جائے تو اس سے

مرعوب ہونے سے بجائے ہم تھوڑی سی کسرِ نفسی کریں تو اس سے ہمارے لئے بڑھنے کے اور راستے کھل جائیں گے۔

جب خود اعتمادی زیادہ ہو جائے تو وہ ایک کمزوری بن جاتی ہے۔ جس سے کام کرنے کی قوت کم ہو کر تگ و دو کی خواہش مٹنے لگتی ہے۔

ایک جماعت میں دو طالب علم تھے۔ انور اور کمال، انور زیادہ ذہین تھا اور کمال ذرا کم۔ دونوں کی خواہش تھی کہ وہ امتحان میں اول رہیں کمال کو اپنی کمزوری کا احساس تھا۔ اس لئے وہ زیادہ محنت کرنے لگا۔ اس نے اپنی طاقت سے پورا کام لینا شروع کر دیا۔ مگر انور کو اپنے ذہن پر بھروسہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کا مدمقابل اس سے ذہنی طور پر کم ہے۔ اسے اپنی یاد پر ناز تھا۔ اس نے ذرا سا مطالعہ کیا اور اُسے سبق ازبر ہو گیا۔

گھر میں ماں یا کوئی اور اگر اسے یہ کہہ دیتا کہ "بھئی ذرا زیادہ محنت کر لو" تو وہ کندھے ہلا کر کہتا۔ "خواہ مخواہ مغز کھپائی کا فائدہ۔ پاس تو ہم ہو ہی جائیں گے۔ باقی رہا اول آنا تو کمال ہی ہے نا۔ کند ذہن کہیں کا"

امتحان آیا اور گزر گیا۔ جب نتیجہ نکلا تو کمال اول تھا اور انور دوم ...... انور کو یقین نہ آتا تھا۔ کچھ رعایت تو نہیں کی گئی؟ اس کے اندر سوال پیدا ہوا۔ مگر جب اس نے ذرا اور سوچا تو اس کے اندر سے آواز آئی "اکثر ہم اپنے متعلق غلط اندازہ کر لیتے ہیں۔ اور ہماری خود اعتمادی ایک کمزوری بن جاتی ہے"

بات کچھ یوں ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ جنھیں قدرت کوئی خاص جوہر دیتی ہے۔ اس جوہر کی نشو ونما کی حق نہیں کرتے۔ بلکہ ان میں ایک قسم کی لاپرواہی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اپنی قابلیت کے متعلق کچھ ایسی غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی کے امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ صرف اپنے تئیں ہی مغالطہ نہیں دیتے بلکہ دوسروں کی نظروں میں بھی گر جاتے ہیں۔ حقیر ہو جاتے ہیں۔

اپنی نظروں میں گر جانا تو خیر بُرا سہی۔ مگر دوسروں کی نگاہوں میں گر جانا بہت ہی بُرا ہے۔

دوسرا نقص خود اعتمادی کے غلط اندازے سے پیدا ہوتا ہے۔ جس سے ہماری شخصیت دوسروں پر اثر نہیں ڈال سکتی۔

ہمارے اندر ایسے جوہر موجود ہیں جو ارد گرد کے لوگوں پر اثر ڈالنے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ اگر ہم دوسروں پر زبردستی اپنا اثر ٹھونسنا چاہیں تو اپنے جوہر اور قوت ارادی کے باوجود ایسا نہیں کر پائینگے اس کے الٹ یہ تک و دو ہمارے اندر ایک وحشیانہ پن پیدا کر دے گی۔ جس سے دوسروں کے جذبات مجروح ہوں گے اور ان کے اندر ہمارے لئے نفرت سی پیدا ہو جائے گی۔

خود اعتمادی کی افراط وحشیانہ پن پیدا کرتی ہے۔ اور اعتدال دوسروں کو تسخیر کرلنے کی قوت۔

دو کھلاڑی کھیل رہے ہیں۔ مقابلہ خوب ہے۔ ان میں سے ہر ایک

مقابلہ جیتنے کے لئے اپنی پوری قوت لگا رہا ہے۔ لیکن آخر کار وہی جیتا جو دونوں میں سے بہتر تھا۔ اس لئے عزت، شہرت اور انعام کا وہی حقدار قرار ٹھہرا۔

دوسرا کھلاڑی اگر اپنی شکست کو اس طریق سے محسوس کرے کہ اس کا مدمقابل واقعی اس سے بہتر تھا۔ ورنہ کبھی نہ جیتتا۔ تو سمجھو اُسے اپنی قوت اور طاقت کا بھی اندازہ ہوگیا۔ یہ ہار اس کے اندر نیا جذبہ پیدا کرے گی۔ اور وہ ترقی کے لئے کوشاں ہوگا۔

اگر ان دونوں کے درمیان وحشیانہ پن آجائے۔ تو پھر دونوں کے خیالات بدل جائیں گے۔ کامیاب کھلاڑی مدمقابل کو گرانے کے لئے کھیل کے اصول توڑنے لگے گا۔ کھیل کی ساری دلچسپی مفقود ہو جائے گی۔ وہ اپنے مخالف پر خونخوار درندے کی طرح جھپٹے گا۔ وہ کامیاب ہوگا۔ مگر اس کی کامیابی مدمقابل کے دل میں نفرت اور انتقام کا جذبہ پیدا کر جائیگی۔ وہ کوشش کرے گا کہ اسے دوبارہ مخالف سے مقابلہ کا موقع ملے۔ اور وہ اپنی شکست کا انتقام لے۔ وہ پھر ایسے ذرائع اختیار کرے گا جو کھیل کی روح کے شایان شان نہیں

دیکھنے والوں کی نگاہوں میں یہ کھیل دلچسپ نہیں وحشیانہ ہوگا۔ انھیں کھلاڑیوں سے الفت کی بجائے نفرت ہونے لگے گی۔

گھمنڈی کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ لوگوں کو اس کی حرکات سے

ٹھیس لگتی ہے۔ جو شخص خواہ مخواہ لڑائی مول لے۔ وہ احمق نہیں تو اور کیا ہے۔ اکثر حالتوں میں ایسے لوگ بری طرح برباد ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مدمقابل سے ایسی شکست کھاتے ہیں کہ عمر بھر اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ کبھی کبھی حقیر سی چیونٹی ہاتھی کو گرا دیتی ہے۔

خود اعتمادی میں افراط ہماری شخصیت کے لئے نقصان رساں ہے وہ ہماری ترقی کی راہ میں روک بن کر ہمیں پچھاڑ دیتی ہے۔ لوگ ہمارے دشمن بن جاتے ہیں۔ ہماری طاقت بجائے ترقی کی طرف صرف ہونے کے دشمنوں سے مقابلہ کرنے میں ضائع ہونے لگتی ہے۔ ہماری شہرت کو نقصان پہنچتا ہے۔ حسد، نفرت اور بے یقینی کے کانٹے ہمارے راستے میں بوئے جاتے ہیں۔

اس کا ایک اور بڑا نقصان یہ ہے کہ ہم میں سے لطافت مفقود ہو جاتی ہے۔ لطافت دراصل مجموعہ ہے۔ اخلاق میں مستعدی، سمجھ سوچ بالغ نظری اور شفقت کا۔ اگر ہم میں یہ صفات نہیں تو ہم دوسروں میں کب مقبول ہو سکتے ہیں۔ بھلا ان کے بغیر ہمیں کون اچھا جانے گا۔

سمجھ بوجھ کے ذریعہ ہم ذہنی طور پر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہمیں دوسروں کے دل تسخیر کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ لطافت کے ذریعے ہم دوسروں کو اپنا سکتے ہیں۔ انھیں اپنا گرویدہ کر سکتے ہیں۔ یہ وہ مرتبہ ہے۔ جب انسان دوسروں پر حکومت کرنے لگتا ہے۔ بھلا وحشی پن سے ایسا ممکن ہے؟

بالغ نظری ایک روحانی قوت ہے۔ ہم دور کی چیزیں دیکھے بغیر

ان کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔

جس شخص میں یہ صفات ہوں وہ دوسروں کے جذبات، احساسات اور خیالات کی قدر کرے گا۔ یہی لطافت کا سرچشمہ ہے۔ اگر یہ وصف بُرے شخص میں بھی پیدا ہوجائے تو اس کی حالت بدل جائے گی۔ اس میں علم، ذہانت اور ادراک کی قوتیں بیدار ہونے لگیں گی۔ اور اس کی شخصیت دوسروں پر اثر انداز ہونے لگتی ہے۔

انسانیت ایک خوفناک دیو ہے۔ اگر اسے قابو میں نہ لایا جائے تو وہ انسان کا بدترین دشمن بن جاتی ہے۔ بم کے گولے سے کھیلنا اتنا خطرناک نہیں جتنا فطرتِ انسانی سے کھیلنا۔

جو لوگ لطافت کے جوہر سے عاری ہیں۔ وہ گویا فطرتِ انسانی کے خطرناک پہلو سے آنکھیں بند کئے اندھا دھند بارود میں چلے جارہے ہیں جہاں ہر قدم پر دھماکے کا خوف اور جان کا خطرہ ہے۔ مگر وہ نہیں جانتے۔ بعض اوقات ایسے لوگوں کی ذاتی ثروت اور طاقت ان کے خلاف مخالفت کو دبا دیتی ہے۔ لیکن جہاں ان میں کمزوری کے آثار نمایاں ہوئے دشمن انھیں کچل کر رکھ دیتا ہے۔

گھمنڈی ثروت اور طاقت کی کمی ہوئی تو پھر اس کی زندگی کے راستے مسدود ہوجاتے ہیں۔ قدم قدم پر اُسے مشکلات کا سامنا ہوتا ہے ذرا ذرا سی ناواجب حرکت پر اُسے سزا ملتی ہے۔ اس کی صلاحیتیں اور قابلیت رائگاں جاتی ہیں۔ کوئی ان کی قدر نہیں کرتا۔ زندگی کی کشمکش زیادہ سخت ہوجاتی ہے

اس کے لئے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ گھمنڈ کو چھوڑ کر ایسی عادت بنائے جس سے وہ دوسروں میں مل جل سکے کسی دانا کا یہ مقولہ کتنا صحیح ہے کہ "مکھیاں شہد سے چمٹتی ہیں۔ سرکہ سے نہیں"

لطافت میں شہد سے زیادہ مٹھاس ہے۔ اس کا اثر زبان تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ دل کی گہرائیوں میں جگہ پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگ آپ کی طرف کھنچے آتے ہیں۔ مگر گھمنڈ اور ناشایستگی سرکہ سے زیادہ ترش ہیں۔ بدمزہ اور مضر۔ تندرست اور صحت مند لوگوں کو سب پسند کرتے ہیں۔ بیمار اور لاغر کے پاس بیٹھنا کسے مرغوب ہوگا۔

موسم بہار میں طبیعت کی روانی اور انفاد طبع ہمیں اکساتی ہے کہ ہم بہار کا لطف اٹھائیں۔ باغات اور نہریں ہمیں روحانی مسرت بخشتے ہیں۔ سردیوں کے دنوں میں گرم کمرے ہمارے لئے راحت کا موجب بنتے ہیں۔ یہی حال زمانے کی گردش سے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کا ہے۔ وہ اپنے مجروح جذبات اور زخمی دل کا مداوا تلاش کرتے ہیں۔ کسی کا ذرا سا سہارا، نرم الفاظ اُن کے لئے موسم بہار کی جاں بخش ہوا سے زیادہ روح پرور اور گرم کمرے سے زیادہ آرام دہ ہوتے ہیں۔ دل کو "خدا کا مقام" کہا جاتا ہے۔ جس سے اس مقام کی حفاظت کی۔ اس نے گویا اپنے لئے لوگوں کی محبت کو خرید لیا۔ جس نے اسے ٹھکرایا۔ وہ خود نفرت کی آگ میں ڈھکیل دیا گیا۔

میٹھے اور رس بھرے الفاظ ایک ایسا جادو ہیں۔ جس کا اثر ہمیشہ کے لئے رہتا ہے۔ جو ایک بار مسحور ہو گیا۔ پھر وہ آپ کا گرویدہ ہو گیا۔

جوں جوں آپ لوگوں کے جذبات کا احترام کریں گے۔ آپ کا یہ سحر زدہ اثر ہوتا جائے گا۔ آپ کو اس سے فائدہ ہوگا۔

خود غرض انسان کے افعال میں منافقت ہوتی ہے۔ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے دوسروں کو بے وقوف بناتا ہے۔ شاید ابتدا میں وہ اپنے ارادوں میں کامیاب بھی ہو جائے۔ مگر جب اس کی بدنیتی ظاہر ہوگی تو پھر جن لوگوں کو اس نے بیوقوف بنایا تھا۔ وہ اس سے نفرت کرنے لگیں گے اس کو ناکام بنانے کی پوری کوشش کریں گے۔ جب کسی شخص کو یہ پتہ چل جائے کہ اُسے بیوقوف بنایا گیا ہے تو اس میں انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جو بہت خطرناک جذبہ ہے۔

خود غرض انسان شاید کامیاب ہو جائے۔ مگر اس کی یہ کامیابی اخلاص کے روشن چہرہ پر ایک بدنما دھبہ ہوگی۔ اخلاص شخصیت کا پاکیزہ لباس پر بدنما دھبہ کتنا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات اخلاص اپنا بدلہ چکانے کے لئے خود غرض انسان کو ایسا ننگا کردیتا ہے کہ اس کی ساری بدباطنی عیاں ہوکر اُسے دوسروں کی نگاہ میں گرا دیتی ہے۔ اخلاص کا انتقام بہت خوفناک ہوتا ہے۔

لیجئے ایک کہانی سنئے۔ یہ کہانی ایک غیر ملکی وزیر کی ہے جو چند سالوں میں ایک معمولی کلرک سے ترقی کرتا ہوا قلمدان وزارت پر قابض ہوگیا۔

اس کا نام لا فرض کر لیجئے۔ لا ایک کاروباری فرم میں ملازم تھا۔

بالکل میرے اور آپ ایسا معمولی کلرک۔ وہ خوب تیز طرار تھا۔ چرب زبان اپنے ملنے والوں سے خوب ظاہرداری برتتا۔ اس فرم کا مالک جہاں وہ ملازم تھا۔ بڑا کنجوس تھا۔ مگر ہ نے آہستہ آہستہ اس پر ایسے ڈورے ڈالے کہ وہ کاروبار میں مالک کا دست راست بن گیا۔ بوڑھے کنجوس کے مرنے سے پہلے اس نے اس کی اکلوتی بیٹی سے شادی کرلی۔ اس کے مرنے کے بعد وہ سارے کاروبار کا مالک بن گیا۔ یہ بات اُسے جاننے والوں کے لئے تعجب کا باعث تھی۔ کیونکہ ایک لڑکی کو اُس سے محبت تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے سے شادی کا وعدہ بھی کرچکے تھے۔ پہلی لڑکی غریب تھی۔ مگر خوبصورت۔ دوسری لڑکی مالدار تھی اور دائم المریض۔

ایک دن اس کی ملاقات اس کے ایک ہم جماعت سے ہوئی۔ وہ بے چارا کسی سرکاری دفتر میں کلرک تھا۔ لا اُس سے بڑے تپاک سے ملا۔ وہ اپنے پرانے ساتھی کو اس حالت میں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ لیکن لا کی خوش گفتاری نے اُسے بہت متاثر کیا۔ اس نے سمجھا کہ اس کا دوست امیر ہو کر بھی اپنے ساتھیوں کو نہیں بھولا۔ لا نے اپنے دوست سے اس کے محکمہ کے متعلق بہت سی باتیں کیں۔ وہ دوست پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں نوکر تھا

لا کی نوازشات بڑھنے لگیں۔ اس دوران میں دوست نے ایک بات محسوس کی کہ لا کی بیوی کبھی کسی صحبت میں دکھائی نہ دی تھی۔ ایکبار اس نے بے تکلفی سے اس بارے میں پوچھ بھی لیا۔

"وہ بیمار ہے" لا نے اس سرد مہری سے جواب دیا۔ کہ وہ پھر کبھی یہ

سوال کرنے کی جرأت نہ کرسکا۔

لا کئی بار اپنے دوست کے دفتر میں بھی گیا۔ اس کے جانیکا وقت وہی ہوتا جب دفتر بند ہو رہا ہوتا۔ چنانچہ وہ اپنے دوست کے پاس تھوڑی دیر بیٹھتا اور پھر اپنی کام کار پر اُسے سیر کے لئے لے جاتا۔ ریستوران میں شام کی چائے پی جاتی۔

اس دوران میں لا ایک حلقہ انتخاب کی طرف سے "مجلس قوانین ساز" کا رکن بھی بن گیا۔ اس نے مجلس کے اجلاس میں خوب دھواں دھار تقاریر بھی کیں۔ بیرونی حکومتوں میں اس کا کافی رسوخ ہو چکا تھا۔

یکایک "مجلس مقننہ" کے اجلاس میں ایک ہنگامہ بپا ہوا۔ ایک خاص خفیہ سرکاری اطلاع کا برسر اجلاس افشا ہو جانا سرکاری حلقوں کے لئے بہت پریشانی کا موجب بنا۔

دوسرے دن لا کے دوست سے باز پرس کی گئی۔ یہ اطلاع ایک ایسی دستاویز کے متعلق تھی۔ جو اس کی تحویل میں تھی۔ دستاویز طلب کی گئی مگر وہ غائب تھی' اس دستاویز کا غائب ہو جانا دوست کے لئے بہت پریشانی کا موجب بنا۔ بیچارے کی زندگی برباد ہو گئی۔ اُسے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ شاید وہ جیل میں ہوتا۔ مگر چونکہ وزارت ٹوٹ چکی تھی۔ اور حزب الاختلاف اب وزارت پر قابض ہو چکی تھی۔ اس لئے معاملہ دب گیا

لا اس وزارت میں لے لیا گیا۔ اس کے دوست نے جانا کہ وہ اس کی امداد کرے گا اور دوبارہ اپنے محکمہ میں لے لیا جائیگا۔ وہ لا کے ہاں

حسب سابق گیا۔ مگر باریابی نہ ہو سکی۔ خادم اُسے پہچانتے تھے۔ مگر اب انکی آنکھیں بدل گئیں۔

ایک دن اسے شرف باریابی بخشا گیا۔ مگر ہ کا لب ولہجہ کاروباری اور تحکمانہ تھا۔ اس نے اپنا حال بیان کرنا چاہا۔ مگر کم فرصتی اور کثرت کار کا بہانہ بنا کر اُسے کمرے سے نکلوا دیا گیا۔ لا کی اس بے رخی اور طوطا چشمی نے دوست کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

لوگوں میں ہ کے خلاف ایک جذبہ نفرت پیدا ہونے لگا۔ اس کا یہ دوست بھی لا کے ہاتھوں نالاں تھا اس لئے اس کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا کل تک جن لوگوں کو وہ اپنا کہتا تھا۔ آج وہ اُن سے بات تک کرنا توہین خیال کرتا۔ جن کی وفاداری نے اس کی ترقی میں امداد کی تھی۔ وہ اُن سے بے وفائی کرنے لگا۔

اس کے خلاف عنصر زیادہ ہوتا گیا۔ ایک دن اُسے وزارت سے دست بردار ہو کر اپنے تئیں پولیس کے حوالے کرنا پڑا۔ اسکی بیوی جس کی دولت نے اُسے ترقی کی راہ پر چلنے کا موقع دیا تھا۔ اس کے خلاف تھی۔ اس بیچاری پر اُس نے وہ ستم ڈھائے کہ توبہ بھلی۔ ایک شہزادہ جسے دوست نے لا کے ہاں امداد طلب کرتے دیکھا تھا۔ اس نے لا کو بیرونی حکومتوں سے تعلقات بڑھانے میں مدد دی تھی۔ لا نے جس سے بھی دوستی بڑھائی اس کی تہ میں کوئی نہ کوئی غرض شامل ہوتی۔ جب اس کا مطلب نکل گیا تو پھر اس نے آنکھیں پھیر لیں۔

اس کی بیوی اور اس کے جگری دوستوں نے اس کے خلاف اس کے مخالفین کی امداد کر کے اسے تباہ کرایا۔ اس کے سنئے ساتھی اس ایسے ہی تھے۔ وہ ان کے ذریعہ جائز و ناجائز طریق استعمال کرتا اور اپنا مطلب نکالتا۔ اس کے خود غرضی نے اس کی آنکھوں پر ایسی پٹی باندھی کہ اسے سوائے اپنے مطلب کے اور کچھ نظر نہ آتا۔ وہ انسان کی بجائے ایک درندہ بن گیا اس کی درندگی خود اس کی تباہی کا موجب بنی

کامیابی ایک طاقت ضرور ہے مگر جب خود غرضی کا ردپ دھار لے تو اس کی طاقت خود کامیابی کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ لا کی شخصیت بڑی انتظریں قابل رشک ہے۔ ایک معمولی کلرک کا وزیر بن جانا۔ مگر یہ کامیابی چند روزہ تھی۔ ایسا شخص ایک ایسے عالی شان محل کی مانند ہے جو آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر تیار کیا گیا ہو۔ اس محل کے چاروں طرف قلعہ بندی کر دی جائے۔ مگر بے سود۔ اس کو نقصان تو اندر سے پہنچے گا۔ اسکی تباہی تو اس کی بنیادوں میں ہی ہے۔

وہ کامیابی جس سے دوسروں کا دل دکھے۔ وہ کامیابی عارضی ہو۔ اُس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ ایک ایسی تباہی جو کامیابی سے زیادہ افسوسناک ہوگی اور آپ کی شخصیت کے لئے نقصان دہ۔

شخصیت کے منفی پہلو

بعض اوقات ہم ایسے لوگوں کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں جو لائق اور قابل ہونے کے باوجود بڑے شرمیلے اور دبے دبے سے رہتے ہیں۔ وہ زندگی کی دوڑ دھوپ میں آگے قدم بڑھانے کی بجائے الگ کھڑے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمیں اکثر نظر آتے ہیں۔

لیجئے ایک قصہ سنئے:۔

ایک لڑکا کھاتے پیتے خاندان سے تھا۔ جماعت میں وہ سب سے زیادہ ذہین تھا۔ اسے امتحان میں اول آنے پر وظیفہ ملا۔ مگر اس نے وظیفہ خود لینے سے انکار کر دیا۔ اور اپنے ایک غریب ہم جماعت دوست کو دلا دیا۔ کیونکہ وہ غریب لڑکا مالی مشکلات سے پریشان رہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اُسے وظیفہ دینے میں غلطی کی گئی ہے۔ اس کا حق دار غریب لڑکا تھا جسے روپے کی ضرورت تھی۔

جب وہ جوان ہوا تو خوش قسمتی سے ایک ایسی اعلیٰ ملازمت مل گئی۔

جہاں وہ چند برس میں کافی ترقی کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا امید وار بھی تھا۔ اس امیدوار سے اس کی معمولی شناسائی تھی اور وہ اُن کے ہاں ایک دو بار جا چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اس جگہ پر لے لیا گیا تو دوسرے امیدوار کے عزیز کیا کہیں گے۔ چنانچہ اس نے اسی خیال کے ماتحت جگہ دوسرے آدمی کو دلا دی۔ اور خود انکار کر دیا۔ اس نے یہ حرکت کر کے گویا دنیا کو بتانا چاہا کہ وہ دوسروں کے لئے قربانی کر رہا ہے

پھر شباب کی مستیوں نے اسے دیوانہ بنا دیا۔ اسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ وہ لڑکی بہت بڑے رئیس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ لڑکی بھی اس سے محبت کرنے لگی۔ اس نوجوان نے اپنی محبت کا اظہار نہ کیا۔ اس کی زبان بند رہی۔ وہ سوچا کرتا۔ کہ وہ ایک رئیس زادی ہے اور وہ اتنا مالدار نہیں۔ ان کا مقابلہ نہ ہو سکتا تھا۔ وہ خاموش رہا۔ لڑکی کو اس کا صدمہ ہوا۔ اس نے دوسری جگہ شادی کر لی جس دن شادی ہونیوالی تھی۔ یہ بھی مدعو تھا۔ اسے رنج ہوا اور فرطِ غم سے بے ہوش ہو گیا۔ لڑکی کو اب اس کی محبت کا پتہ چلا۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔

ایک دن اُسے ایک سونے کا ہار گرا ہوا ملا۔ اس نے فوراً اٹھا کر پولیس میں دے دیا۔ ایک سال تک تلاش ہوتی رہی۔ آخر کار پولیس نے لاپتہ سمجھ کر یہ ہار اُسے واپس کرنا چاہا۔ اس کی بیوی ایسے ہار کیلئے بیتاب تھی۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ یہ پرایا مال تھا۔

اسی طرح اس نے زندگی میں بہت سی حماقتیں کیں۔ اُسے ترقی کا جو

موقعہ تھا۔ وہ اُس سے فائدہ اٹھانے کی بجائے کسی نہ کسی بہانے اسے
ترک کر دیتا۔ وہ یہ سب حماقتیں نیک نیتی سے کرتا رہا۔ اس نے اعلیٰ
ملازمت، محبت اور نفع کو محض اپنے بچپنے کی وجہ سے ٹھکرا دیا۔ اب وہ
برباد شدہ انسان تھا۔ یہ بربادی خود اس کی اپنی مول لی ہوئی تھی۔
یہ ایک مثال ہے۔ ایسے ہزاروں لوگ ہمیں ملتے ہیں۔ جن کی
حماقت انھیں زندگی بھر ناکام رکھتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید وہ اس
طرح ہر چیز کو ترک کرنے سے کامیاب ہو سکیں گے۔ حالانکہ وہ کامیابی
کے موقعوں کو خود ترک کرتے رہتے ہیں۔ زندگی میں مواقع کم ملتے ہیں
جسے ترقی کا موقع میسر آ جائے اور وہ محض اپنے کسی خیال کے ماتحت
چھوڑ دے تو یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ شخص احمق ہے۔ جس چیز
کو وہ دیانت داری خیال کرتا ہے، وہ دراصل بے وقوفی ہے۔
وہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اُن کی قربانی سے دوسرے لوگ ان کی
قدر کریں۔ انھیں عزیز جانیں مگر نتیجہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ لوگ اُن کا
مذاق اُڑاتے ہیں۔ اُن کی نیکی کو حماقت سمجھ کر ان کی بے وقوفی سے فائدہ
اٹھاتے ہیں۔

ایسے لوگ جب دنیا اور دنیا والوں سے مایوس ہو جاتے ہیں
تو خواب کی دنیا میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ آخر انھیں زندہ رہنا ہے۔
خواب کی دنیا میں کھو کر وہ اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ پھر جو بھی ان سے
متعلق ہوا، وہ بھی بدقسمت ہی کہلایا۔ ان کا خاندان بھی ایسے لوگوں سے

بے زار رہتا ہے۔

آہستہ آہستہ یہ لوگ حد سے زیادہ حساس ہو جاتے ہیں۔ ان کے لئے زندگی کی حقیقت واہمہ بن جاتی ہے۔ وہ عمل کی بجائے صرف سوچتے ہیں۔ عمل اور سوچ کا امتزاج ہی کامیابی پیدا کر سکتا ہے۔ ورنہ محض تخیل تو ہوا میں قلعے تعمیر کرنا ہے۔

انسانیت اس قدر ترقی کے باوجود ابھی تک جہالت کے پہلے دور میں ہی ہے عام لوگوں کی حالت تو ان درندوں کی سی ہے جو ایک باڑے میں بند کر دیئے جائیں۔ یہ درندے بھلا کیا جانیں کہ محبت اور شفقت کیا شے ہے۔ جو شخص ایسے درندوں سے پیار بھری باتیں کرے۔ ان سے نرم آواز میں بولے اور انھیں اپنا کھانا پیش کر دے۔ وہ احمق نہیں تو اور کیا ہے۔ آپ کو ان کے خونخور پنجوں اور تیز دانتوں کا شاید علم نہیں ہے آپ کی سادہ لوحی نے آپ کو دھوکا دے رکھا ہے۔

بھلا وحشی جانور جسے خون پینے میں مزا آتا ہے۔ اُسے پیار سے کیا کام۔ اس کا کام تو چیرنا پھاڑنا ہے۔ وہ انسان جن کی زندگی کا دارومدار ہی دوسروں سے لڑنے جھگڑنے پر ہو۔ جو انصاف اور حق پرستی کے الفاظ سے ناآشنا ہو۔ بھلا اُسے نیکی کا کیا پتہ؟ حسن سلوک اسکے لئے بے معنی چیز ہے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسانیت کے افق پر ابھی تک تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ لوگ ابھی تک لفظ (Integrity) کے مفہوم کو

نہیں سمجھ سکے۔ ہم میں سے جب کوئی شخص ذرا علو مرتبت ہوتا ہے اور وہ اس نور سے جو اسے میسر آتا ہے ہمیں روشن کرنا چاہتا ہے تو ہم اس سے فیض یاب ہونے کے بجائے مخالفت کرنے لگتے ہیں۔ ہم اس نور کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔

جو شخص ہم میں سے بڑا ہو جائے۔ اُسے چاہیے کہ وہ بجائے آسمانی مخلوق بننے کے لوگوں میں ایک بن جائے۔ وہ عام لوگوں کی ذہنیت کو سمجھے۔ ان کی خامیوں کو پیش نظر رکھے۔ ورنہ اس کا انجام بُرا ہوگا۔ رنج و محن ان کی ہمت کو توڑ دیں گے۔

شخصیت کی راہ میں ایک اور روک ہے۔ وہ عدم اعتماد ہے یہ بذاتِ خود ایک نقص ہے۔ جس کے باعث اور بہت سے نقائص پیدا ہو جاتے ہیں۔ جس شخص کو اپنے آپ پر اعتماد نہیں۔ وہ شخص شرمیلا ہوگا۔ اس میں بوداپن پیدا ہو جائے گا۔ جو نہ صرف اسکے جسم کے لیے مضر ہے بلکہ اس کی روح تک مفلوج ہو جاتی ہے۔ شرمیلا آدمی ایک ایسا جسم ہے جس میں روح نہیں۔ وہ کسی دوسرے کے سامنے اظہار مطلب نہیں کر سکتا۔ ایسے لوگ لاکھ ذہین، خوبصورت اور قابل ہوں۔ لیکن اگر وہ اظہار مطلب نہیں کر سکتے۔ یا انھیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہے۔ تو اس ذہانت، خوبصورتی اور قابلیت کا فائدہ ——؟

اپنے آپ پر اعتماد کا فقدان خود اپنے آپ سے حسد پیدا کرتا ہے۔

پھر یہ حسد خوف میں تبدیل ہوکر شخصیت کی راہ میں روک بن جاتا ہے۔ خوف سے دل کمزور ہوتا ہے۔ کمزور دل سے پھر کمزور افعال سرزد ہونے لگتے ہیں۔ وہ حصول مقصد کے لئے ایسی حرکات کرنے لگتا ہے جو اسے دوسروں کی نگاہ میں ذلیل کردیتی ہیں۔ حالانکہ اُسے چاہئے تھا کہ وہ باعزت ہوکر رہتا بدقسمتی یہ ہے کہ ایسے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ وہ کیا کررہے ہیں۔ وہ اپنے تئیں سمجھ نہیں سکتے۔

ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ ایک کنسرٹ میں ایک نوجوان لڑکی کو گانے کے لئے کھڑا کیا گیا۔ اس کے گلے کی کافی تعریف سنی گئی تھی۔ اس محفل میں سب کے سب لوگ اس کے گانے کے مشتاق تھے۔ کیونکہ وہ اپنی سہیلیوں میں اچھی طرح گا سکتی تھی۔ مگر یہاں عجیب واقعہ پیش آیا۔ اس کا رنگ متغیر ہونے لگا بجلی کی روشنی نے اس کے چہرے کی غمازی لوٹ لی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ لوگوں کے ہجوم سے وہ خوفزدہ تھی۔ اس لئے گانا چاہا۔ مگر آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ بڑی مشکل سے اس نے بھرائی ہوئی آواز نکالی۔ اور اس کے بعد —— لوگوں کی مایوسی، پھبتیاں، وہ لڑکی بڑی مشکل سے اپنی جگہ تک واپس آسکی۔ وہ خوف اور شرم سے پسینہ پسینہ ہورہی تھی۔

اس کے اندر گانے کا جوہر موجود تھا۔ وہ گا سکتی تھی۔ مگر بُرا ہو شرمیلے پن کا اس کی خداداد نعمت اس کے کام نہ آئی۔ بلکہ وہی جوہر اسکے لئے وبال جان بن گیا۔ وہ شرم سے لوگوں کے سامنے آنے سے گھبرانے لگی۔

ایک اور واقعہ سنئے :-

ایک صاحب بہت خوبصورت تھے اور ایک بہت بڑے عہدہ پر ممتاز۔ انھیں بیوی بھی اپنے ایسی ملی۔ دونوں کا جوڑا خوب تھا۔ انھیں ایک دوسرے سے محبت بھی حد سے زیادہ تھی۔ ایک دن انھیں ایک ایسی محفل میں جانا پڑا' جہاں مخلوط مجمع تھا۔ میزبان ایک بیگم نواب تھیں۔ میزبان نے ان صاحب کو کسی بات کے لئے بلایا۔ اسی اثنا میں اس جگہ جہاں اُن کی بیوی بیٹھی تھیں۔ دو صاحب اور آن بیٹھے۔ ایک ادھیڑ عمر کے تھے۔ دوسرے نوجوان۔ ان کی بیوی ان سے باتیں کرنے لگیں۔ یہ صاحب ست پٹائے۔ ان کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ میزبان تاڑ گئیں۔ وہ انھیں کمرے کے کونے میں لے گئیں جہاں قد آدم آئینہ آویزاں تھا۔

" ذرا دیکھئے وہ کون ہے ـــــ ؟ بیگم نے آئینے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ صاحب آئینہ میں اپنا عکس دیکھنے لگے۔

"یہ صاحب" میزبان نے عکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "نوجوان ہیں۔ خوبصورت ہیں۔ ان کے بال کتنے حسین ہیں۔ انکا لباس کتنا قیمتی اور چست ہے۔ مگر ـــ" پھر وہ مڑیں۔ "وہ بوڑھا" انھوں نے اس کی بیوی کے پاس بیٹھے ہوئے شخص کی طرف دیکھا۔ "ادھیڑ عمر چہرے پر جھریاں' گنجا سر' ڈھیلا ڈھالا۔ اور دوسرا شخص' سبحان اللہ' کہاں آپ اور کہاں وہ ـــ عورت یہ تمیز کرسکتی ہے۔

میزبان جا چکی تھی۔ اور وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا بیوی کی طرف بڑھا۔ ادھیڑ عمر کا آدمی اس کی بیوی کو "بیٹی" کہہ کر پکار رہا تھا۔ اور دوسرا نوجوان محترمہ بہن ـــ" وہ شرمندہ ہوگیا۔ اُسے بیوی پر شک ہوا تھا۔ یہ خود اس کی کمزوری تھی۔ اسے اپنے آپ پر اعتماد نہ تھا۔ ورنہ وہ کبھی ایسا نہ سوچتا۔۔ ہم اگر اپنے آپ پر اعتماد رکھیں تو اپنی خوبیوں کو اچھی طرح جان سکتے ہیں۔

آپ ذرا اس کہانی کے دوسرے پہلو پر غور کیجئے۔ آپ سے زیادہ آپ کی بیوی کو اپنے آپ پر اعتماد ہے۔ وہ اپنی تمام رعنائیوں کے باوجود ان دو مردوں سے اس طور سے ملی ہے کہ اُن کے دل میں جذبۂ تقدیس پیدا ہوگیا۔ ایک نے اس کا اظہار بیٹی کہہ کر کیا اور دوسرے نے محترمہ بہن۔ عورت کا اعتماد اُسے چند لمحات میں ایک ایسے مقام پر لے گیا۔ جو قابل تعظیم ہے۔ مگر اس کے وہم نے اسی عورت کی حیثیت کو اتنا گرا دیا کہ آپ پر شک کرنے لگا۔

سمجھنے اور نہ سمجھنے کے ذرا سے فرق زندگی کے دو پہلو ہمارے سامنے پیش کئے ہیں۔ ایک زندگی میں راحت، سکون اور تقدس پیدا کرتا ہے دوسرا پہلو زندگی کو جہنم سے بدتر بنا دیتا۔

روزمرہ کی زندگی میں ایسے واقعات اکثر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جہاں اپنے آپ پر عدم اعتماد کے باعث ذہن میں ترقی کی ساری سوتیں خشک ہوجاتی ہیں۔ ایسے لوگ پھر قسمت کا گلہ کرنے لگتے ہیں

بھلا وہ کسان جو بادو باراں کے طوفان کے خوف سے بیج ہی نہ بوئے کیا فصل کاٹے گا۔ اگر ایک مضبوط اور توانا شخص اپنے بازوؤں سے کام لینا ترک کردے تو اس کا جسم کس کام کا۔ وہ تو بالکل ایک ایسی شور زمین کی مانند ہو گا جہاں گندم کا دانہ دبا دیا جائے۔ لیکن آبیاری نہ کی جائے۔

ہم جس دنیا میں رہتے ہیں اس میں ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جنھیں اپنے آپ پر بالکل اعتماد نہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے انسانیت کو بدنام کر رکھا ہے۔ ان کے اندر حسد اور جلن کی بیماری عام ہے۔ اعتماد کی کمی نے ان میں نفرت اور جرم کو پیدا کیا ہے۔

قدرت فیاض ہے۔ وہ اپنی فیاضی سے ہر انسان کو بہرہ ور کرتی رہتی ہے۔ مگر بدقسمتی تو یہ ہے کہ لوگ قدرت کی ان فیاضیوں سے آشنا ہی نہیں ہوتے۔ اگر وہ ان سے آگاہ ہو جائیں اور اپنی ودیعتوں کو کام میں لانا شروع کر دیں تو انسانیت کے بہت سے روگ دور ہو جائیں۔ نفرت اور حسد کی جگہ اعتماد اور امید لے لے۔

آپ نے پریوں کی یہ کہانی سنی ہوگی۔ کہ ایک جنگل میں ایک لکڑہارا رہا کرتا تھا۔ اس کی بیوی بہت نیک عورت تھی۔ اس کے ہاں توام لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ دونوں ابھی کم عمر ہی تھیں کہ ایک دن جنگل کی ایک پری نمودار ہوئی۔ وہ ماں سے مخاطب ہو کر کہنے لگی: "تمھاری لڑکیاں تمھیں مبارک ہوں۔ تمھیں کسی چیز کی حاجت نہیں رہے گی۔ یہ نوجوان

ہولیں - میں پھر آؤں گی۔" پری نے ایک کا نام عشرت اور دوسری کا نام دل آرا تجویز کیا۔

لکڑہارے کی جھونپڑی خوشی سے بھر گئی۔ کئی برس بیت گئے۔ مگر اس دوران میں کبھی انھیں کسی طرح دکھ یا رنج نہ ہوا۔

عشرت اور دل آرا اب بیسویں برس میں تھیں۔ لیکن اس عرصے میں وہ پری پھر کبھی نہ آئی۔ ایک شام دونوں بہنیں ایک پرانے درخت کے نیچے بیٹھی کچھ سی پرُو رہی تھیں کہ اچانک ان کے سامنے ایک نور پھیل گیا۔ اور پھر اس نور میں سے ایک پری نمودار ہوئی۔ دونوں لڑکیاں ڈر گئیں۔ لیکن پری کی میٹھی اور سریلی آواز نے ان کا خوف دور کر دیا۔

" بیٹیو! میں تمھاری دینی ماں ہوں۔ اب تم جوان ہو۔ میں تمھارے لیے خاوند لائی ہوں۔ انھیں پسند کر لو۔"

دو نوجوان لکڑہاروں ایسا لباس پہنے کھڑے تھے۔ دونوں بہنیں خوش ہو گئیں۔

چند دنوں کے بعد ان کی شادی رچائی گئی۔ سب کا خیال تھا کہ چونکہ پری ان کی دینی ماں ہے اس لیے وہ کوئی نایاب تحفہ لائے گی۔ مگر اس نے انھیں ایک ایک جھونپڑی اور اس کے ساتھ ایک ایک چھوٹا سا باغیچہ دے دیا۔ سب لوگ حیران تھے۔ پھر وہ بولی "کام کرنے والے ہاتھ سونا پائیں گے۔ نکمے ہاتھ دھول پھونکیں گے۔" یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔

دونوں بہنیں اپنے اپنے جھونپڑے کو سدھاریں۔ دل آرا نے

جاتے ہی گھر کو صاف کیا۔ جو کچھ معمولی سامان موجود تھا اُسے قرینے سے لگا دیا پھر وہ باغ کی طرف متوجہ ہوئی۔ چند دنوں میں باغ بھی پھولوں سے بھر گیا۔

عشرت کی حالت اس سے الگ تھی۔ وہ اپنے جھونپڑے میں جا کر لیٹ رہی۔ اُسے جھونپڑے میں آنا پسند نہ تھا۔ وہ کئی دن اسی حالت میں رہی۔

ایک دن دونوں خاوند غائب ہو گئے ــــ دل آرا نے ہمت نہ ہاری بلکہ وہ اپنے کام میں مصروف رہی۔ اس کے باغ میں پھول کھلتے رہتے اور وہ ان سے دل بہلاتی رہی۔ مگر عشرت پہلے ہی اپنی حالت سے بیزار تھی اس نئی مصیبت نے اس کا اور برا حال کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے بہن سے حسد ہونے لگا۔ وہ حیران تھی کہ اس کی بہن کے گھر سب کچھ تھا۔ مگر وہ فاقہ کر رہی تھی۔ اس کا سبب کیا تھا۔ اسے معلوم کرنے کے لئے ایک رات وہ بہن کے ہاں پہنچی۔ اس نے جاتے ہی سخت کلامی شروع کر دی

"تمھارے گھر آرام اور دولت ہے۔ اور میں بھوکوں مر رہی ہوں۔ تمھیں شرم نہیں آتی۔ تمھارا خون اتنا سفید کیوں ہو گیا ہے۔ اور وہ ہماری دینی ماں ــــ تم پر مہربان ہے اور مجھے ــــ"

"ایسا نہ کہو بہن" دل آرا نے اُسے دلاسا دیا "پری تو ہر روز مجھے کھانا بھیجتی ہے۔ کیا تمھیں نہیں بھیجتی ہے؟"

"بھیجتی ہے خاک!" عشرت نے غصے سے جواب دیا۔

دل آرا نے اُسے اپنا کھانا پیش کیا۔ بہن نے جونہی ہاتھ بڑھایا

تو وہ کھانا راکھ بن گیا۔ اوپر سے آواز آئی۔ "نکمے ہاتھ دھول جھونکیں گے"

اس کے بعد عشرت اصل حقیقت جان گئی۔ وہ بھی کام کرنے لگی۔ اس کے ہاں بھی خوشحالی نظر آنے لگی۔ اس کا باغ بھی پھولوں سے مہک اٹھا۔

یہ کہانی کتنی اچھی ہے۔ عشرت کی جھونپڑی ہمارا دل ہے۔ اگر ہم کام نہ کریں۔ تو اس کا انجام وہی ہوگا۔ جو عشرت کا ہوا۔ مگر جوں ہی ہمارے ہاتھ کام کرنے لگیں گے۔ دنیا کی دولت ہمارے پاؤں پڑیگی تکلیف اور ناکامیاں راستے سے دور بھاگ جائیں گی۔

پری کا تحفہ ہماری شخصیت ہے۔ جسے ہم خود اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں اس کا نتیجہ ہمیں کامیابی اور فارغ البالی میں ملتا ہے۔ قسمت کا سنہری تاج ہمارے سروں پر پہنایا جاتا ہے۔

ان دونوں بہنوں کو اپنی دینی ماں کے قول پر جو اعتماد تھا، سے اپنے آپ پر اعتماد کے برابر خیال کرلیں۔ اس کے بعد ہر قسم کی برائی اور دکھ آپ سے دور رہے گا۔ آپ کے اندر اچھے اوصاف پیدا ہونے لگیں گے۔ ایک طاقت اور قوت آپ کو کامیابی کی راہ پر گامزن کردیگی۔

شخصیت کی راہ میں ایک اور روک بے اعتدالی ہے۔ ہم میں سے بعض لوگ بہت سی صفات اپنے اندر رکھتے ہیں۔ لیکن اُن میں اعتدال نہیں ہوتا۔ بلکہ کبھی کبھی وہ حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ جس کا

خمیازہ انھیں بُری طرح بھگتنا پڑتا ہے۔

ہم ایک دیوار بنانا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس عمارت کے لئے بہترین سامان ہے۔ مگر دیوار سیدھی نہیں اٹھی۔ بے ترتیب ہے۔ کیا آپ خیال کرسکتے ہیں کہ یہ دیوار قائم رہ سکے گی۔ ہرگز نہیں۔ آج گری یا کل۔ گرے گی ضرور۔

جو شخص کام نہیں کرتا۔ بلکہ محض فضول کڑھتا رہتا ہے۔ اس کی حالت عشرت ایسی ہے۔ شخصیت کے لئے لازمی ہے۔ کہ وہ ہر حال میں خوش رہے۔ دکھ ہو یا سکھ۔ وہ کام کئے جائے۔ ورنہ فطرت لاکھ فیاض ہوتی رہے۔ اگر آپ ان فیاضیوں سے پوری طرح فائدہ حاصل نہیں کرتے۔ تو یہ سب نعمتیں بے فائدہ ہیں ان نعمتوں سے جتنا زیادہ فائدہ حاصل کیا جائے اُسی قدر زیادہ کارآمد شخصیت تیار ہوگی۔

اس سلسلہ میں آخری بات میانہ روی ہے۔ غرور اگر بُرا ہے۔ تو فروتنی جب پستی کی حد تک پہنچ جائے تو اس سے بھی زیادہ بُری ہر شخصیت اسی حالت میں جاذب نظر ہوتی ہے۔ جب ہمارے اعمال میں اعتدال ہو۔ ہم فطری دولتوں میں توازن قائم رکھیں۔ ہماری عادات میں باقاعدگی اور نظم ہو۔ تاکہ ہم زندگی کی دوڑ میں خوب تگ و دو کرسکیں یہی وہ گر ہے۔ جس پر عمل کامیابی اور عمل نہ کرنا ' ناکامی کا باعث ہوتا ہے۔

شخصیت کی خامیاں

کہانی کے اجزا ہم نے ان اوراق میں بیان کر دیے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ان اجزا میں سے بعض ایسی خصوصیتیں موجود ہیں جن کی وجہ سے کسی خاص شخص کی کہانی نہ صرف دلچسپ ہوتی ہے بلکہ ہم اس متاثر ہوتے ہیں۔ ہمیں بار بار اُن کی یاد آتی ہے۔ مگر بعض اجزا ایسے بھی ہیں۔ جن سے ہمیں کوفت ہوتی ہے وہ تاثر جو کہانی نے پیدا کیا تھا زائل ہونے لگتا ہے۔ شخصیت ایک خدا داد نعمت ہے اس کو زیادہ موثر بنانے کے لیے اس میں ایسی صفات پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جن کی وجہ سے شخصیت اور زیادہ محبوب ہو جائے اور ایسی باتوں سے بچنا چاہیے جن سے اس کی ہر دلعزیزی میں فرق آئے۔

شخصیت ایک طاقت ہے۔ اس کا مفید یا غیر مفید ہونا اس طاقت کے استعمال پر منحصر ہے۔ اس طاقت کے صحیح استعمال کے چند طریقے بھی ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلا طریق اظہار کا ہے جو کچھ

کہ آپ ہما دہی ظاہر کیجئے۔ تصنع یا بناوٹ کی ضرورت نہیں۔ دوسروں کی نقل کرنا شخصیت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ آپ کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے اگر کوئی یہ کہے کہ آپ کے طور طریق فلاں صاحب سے ملتے جلتے ہیں۔ تو یہ اچھا ہے۔ یا یہ کہ وہ کہے کہ "صاحب! یہ حضرت کتنے جدت پسند (original) ہیں" آپ کی شخصیت آپ کو نمایاں کر رہی ہے۔ آپ کی جدت پسندی آپ کی شخصیت کو نمایاں کرے گی۔

ہماری دنیا میں پیروی کرنے والے زیادہ ہیں۔ وہ اسی میں اپنی بھلائی سمجھتے ہیں کہ کسی دوسرے کی طرح عمل کرے۔ ان کے ذہن میں کوئی نئی بات نہیں آتی۔ وہ زندگی بسر کرنے کے لئے مختلف طریقے (SYTLES) اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اُن میں سے کسی ایک کو بھی اپنا نہیں کہہ سکتے۔ اگر ہم جدت پسندی سے کام لیں۔ اور ایسے طریق سے زندگی بسر کریں جو ہمارا اپنا طریق ہے۔ تو اس سے ہمارے اندر خود اعتمادی اور برتری پیدا ہو گی۔

جدت پسندی نت نئی باتیں سکھاتی ہے۔ اس سے ہمارے لئے زندگی کے کئی باب وا ہوتے ہیں۔ ہم ان دروازوں سے جھانکی لگا کر زندگی کے مختلف پہلوؤں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

شخصیت کی نمائش کے سلسلہ میں فیشن کا ذکر بھی لازمی ہو گا۔ خوبصورت جسم والا انسان اعلیٰ لباس پہنتا ہے۔ تاکہ اس کی شخصیت زیادہ نمایاں ہو۔ یہ فیشن کیا ہے؟ یہی کہ لباس کو ایسے طریق سے زیب تن

کرنا کہ ہمارا جسم خوبصورت معلوم ہو۔ ہم گفتگو اس طرح کریں کہ سننے والوں کو بھلی لگے۔ کھائیں پئیں تو ایسے کہ دیکھنے والا کراہت محسوس نہ کرے۔ گھر بنائیں تو ایسا کہ ہر کوئی تعریف کرے۔ اس طرح جو معیار ہم قائم کرتے رہتے ہیں۔ یہ کہاں سے آتے ہیں؟ یہ دوسرا سوال ہے۔ اس کا جواب بالکل آسان ہے کہ ایسی شخصیت کے دماغ سے جو جدت پسند تھا۔ یہ شخصیت عام لوگوں ایسی نہیں ہوتی۔

ڈارون کا نظریہ کہ انسان کے آبا و اجداد بندر تھے۔ درست ہے یا نہیں۔ مگر یہ بات ضرور ہے کہ ہم بندروں کی نقالی ضرور کرتے ہیں۔ جو چیز ہمیں بھلی معلوم ہو۔ ہم فوراً اس کی نقل کرتے ہیں۔ یہ نقالی جسے فیشن کا حسین نام دیا جاتا ہے۔ ہماری سب سے بڑی حماقت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ابھی تک اپنے ظاہر (EXPRESS) کرنے کے طریقے معلوم نہیں کر سکا۔ بلکہ فیشن اس کے رگ و پے میں سرایت کر کے اس کی تنگیٔ دامن کی غمازی کرتا ہے۔

اگر ہم جدت پسند ہیں۔ تو انسانوں کے اس ہجوم میں جہاں تقلید سب سے بڑا وسیلۂ زندگی، اپنے لئے ایک بلند مقام حاصل کر لینا کوئی مشکل بات نہیں۔ صرف اس قدر احتیاط کی ضرورت ہے۔ کہ ہم انفرادیت قائم رکھیں۔ اور عوام کے ساتھ ایک ہی رو میں نہ بہہ جائیں۔

جدت پسندی کے ساتھ ساتھ اپنے اندر ایسی صفات پیدا کرنا بھی

ضروری ہے جس سے لوگ ہماری تعظیم کریں۔ تعظیم، حقیقت میں ایک رائے ہے جو ہم کسی دوسرے شخص کی صفات دیکھ کر قائم کرتے ہیں۔ تعظیم کرانے کے لئے ہمیں ایسے کام کرنے ہونگے۔ جن کے ذریعے لوگ ہماری قدر و قیمت کو جانیں اور اُن کو پہچانیں۔

تعظیم کرانا بہت مشکل کام ہے۔ مگر یہ مشکل ذرا سی موقعہ شناسی، فراست اور سمجھ بوجھ سے حل ہو سکتی ہے۔ دوسروں کو اپنا لینا اس مشکل کا آسان ترین علاج ہے۔ انھیں اپنانے کے لئے انھیں سمجھنا ضروری ہے۔ جب ہم انھیں سمجھنے لگیں گے۔ تو پھر ان کی خوبیاں اور کمزوریاں ہمارے سامنے ہوں گی۔ دوسروں کی کمزوریاں چھپانا اور ان کی اُجاگر کرنا ہمیں دوسروں کی نگاہ میں ممتاز کر دیتا ہے۔ ان کا کوئی فعل اگر ہمیں ناپسند ہے۔ تو اس کا اعلان نہ کیا جائے۔ بلکہ چشم پوشی سے کام لینا لازمی ہے۔ اگر کہیں اپنے مفاد کی قربانی سے دوسرا شخص اپنا بنتا ہے۔ تو ضرور قربانی کر دی جائے۔ قربانی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ جب ہم ان ذرائع سے کسی کو اپنا لیں۔ تو پھر اپنا بنائے رکھیں۔ ایسے شخص کا ضائع ہو جانا اچھا نہ ہوگا۔

زندگی میں آپ ایسے لوگوں سے بھی ملیں گے، جو ڈون کی لیتے ہیں۔ اور اپنے منہ میاں مٹھو بن کر نہ صرف مضحکہ خیز بنتے ہیں بلکہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو بھی مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں جی تو یہی چاہتا ہے کہ انھیں منہ پر ان کی حماقتوں کے بارے میں کہہ دیا جائے۔

مگر نہیں۔ ایسا کبھی نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ نہایت سمجھ سوچ کے ساتھ ایسے لوگوں سے بات چیت کی جائے۔ تاکہ اُن کے دل کو بھی ٹھیس نہ لگے۔ اور بات بھی بن جائے۔ کون جانے یہی شخص کل ہمارے لئے کتنا مفید ثابت ہوگا۔

اپنی کامیابی کے لئے ہر ممکن طریق سے تگ و دو کرنا جائز ہے۔ جو بھی طریق اختیار کیا جائے اس کی بنیاد ہمیشہ اخلاص پر رکھی جائے۔ جس کام کی بنیاد اخلاص پر ہوگی۔ اس کے نتائج کبھی ضرر رساں نہیں ہو سکتے۔

کامیابی کے لئے قوی ہونا ضروری ہے۔ مگر قوی کو مغرور اور خود سر نہیں ہونا چاہیئے۔ زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہونا کامیابی ہے۔ مگر اس نفاست سے کہ آپ کا حاوی ہونا کسی کو بُرا نہ لگے۔ لوگوں کی خدمت کیجئے مگر ایسے کہ وہ خود بخود آپ کے گرویدہ بن جائیں۔

عام لوگوں کی ذہنیت کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ جو شخص تیوری چڑھائے دکھ اور تقدیر کا رونا روتا رہے۔ لوگ اس سے دور بھاگتے ہیں۔ ہنستے کا ہر کوئی ہوتا ہے۔ مگر روتے کو لوگ اور رلاتے ہیں۔ وہ خوش رہنا چاہتے ہیں۔ جو شخص انھیں منہ بسورے مل جائے۔ وہ اس کی درگت بناتے ہیں۔ انھیں خوش کرنے سے ان کے دلوں میں ہمارے لئے جگہ بنتی ہے۔ لوگ ہمارے معاون بن جائیں گے۔ ان کی ہمدردی مفت میں حاصل ہوگی۔ آپ کے محفل میں آتے ہی خوشی کی لہر دوڑ جائے گی۔ لوگ مسکرا کے آپ کو خوش کریں گے۔ زندگی کے مختلف مقامات پر انھیں میں سے اکثر

آپ کے مدد معاون بن جائیں گے۔

اپنے مدد معاون بنانے کے لئے اپنے تعلقات کو وسیع کرتے رہیں۔ قدرت کی طرف سے آپ کو ایک نہ ایک جوہر ضرور ملا ہوا ہے۔ اس کی تکمیل کر کے اسے اپنی شخصیت کا جزو بنالیں۔ پھر اس سے دوسروں کو اپنائیں۔ جتنا آپ دوسروں کو اپنے نزدیک لانے کی کوشش کرینگے اُسی قدر زیادہ آپ کی شخصیت محبوب و مقبول ہوگی۔

ہم بار ہا دیکھتے ہیں کہ ہمارے ساتھیوں میں سے جب کوئی ترقی کرنے لگتا ہے۔ تو ہم میں سے ہی کئی لوگ حسد کرنے لگتے ہیں۔ اگر ایسا شخص اکیلا رد کران کا مقابلہ کرنا چاہے۔ تو یقیناً اس کی ترقی رک جائیگی کیونکہ اس کی ساری طاقت راستہ صاف کرنے میں ہی صرف ہوگی۔

انسان فطری طور پر کسی دوسرے کو بڑھتا نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے جب ہم ترقی کے زینے پر قدم رکھنا چاہیں۔ تو اپنے ارد گرد کی ساری روکوں کو دیکھیں۔ زینے پر چڑھنا ہمارا مقصد ہے روکوں سے الجھنا نہیں۔ اس لئے ان روکوں کو اپنا مدد بناتے ہوئے ہم قدم اٹھاتے جائیں۔ بے تعلق زندگی، زندگی نہیں ہوتی۔ اکیلا آدمی بھلا کس کام کا دوسروں کو اپناتے ہوئے بڑھو۔ وہ لوگ جو آپ کی راہ میں روک بن رہے ہیں۔ انھیں اپنا معاون بنالو۔ استقلال اور ہمت سے کام لو۔ زندگی کی تگ و دو میں جلد بازی ہمیشہ نقصان پہنچاتی ہے۔ یہ سفر آہستہ آہستہ ہونا چاہئے۔ جو قدم اٹھے وہ مضبوط ہو، تاکہ پھر پیچھے نہ ہٹے۔ چلنے والا چوکس ہو۔

وہ دیکھتا رہے۔ کہ اس دور سے اس سے پیچھے آنے والے کہیں اس سے آگے نہ بڑھ جائیں۔

ہم پھر کہیں گے کہ اپنی عزت کرانے کے لئے دوسروں کی عزت کی جائے۔ انھیں اپنایا جائے۔ غرور اور نخوت لوگوں کو اپنے سے دور لے جائیں گے۔ انھیں آپ سے نفرت ہوگی۔ جب آپ نے دوسروں کو اپنا لیا تو پھر ہر کوئی آپ کا ہی ہوگا۔ زندگی میں سکون پیدا ہو جائے گا

سادہ زندگی بھی ایک وصف ہے۔ جس سے آپ کی تعظیم ہو سکتی ہے لوگ آپ کی عزت کریں گے۔ غرور آپ کو وہ عزت نہیں دے سکتا۔ جو سادگی کے ذریعے میسر آتی ہے۔ دلوں کو اپنانا سب سے بڑی کامیابی ہے

موقع شناسی

زندگی کی کشمکش میں بعض لوگ ہمیں کامیاب نظر آتے ہیں۔ جو آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور پھر یکایک ہم یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ ان میں سے اکثر بُری طرح تباہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے شاید ہی کوئی سنبھل سکا ہو۔ اس کا باعث دراصل یہ ہوتا ہے۔ کہ ایسے انسان اپنی اس کشمکش میں یہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا میں اور بھی لوگ بستے ہیں اُن کی نفرت اور حسد انھیں ترقی کی راہ سے روک سکتے ہیں وہ نہیں سمجھتے کہ وہ بے بس لوگ جنھیں وہ کچلتے ہوئے آگے بڑھتے تھے۔ اتنے خطرناک بھی ہو سکتے ہیں کہ انھیں کچل دیں۔

اخبارات کے کالم آئے دن ایسے واقعات سے پُر ہوتے ہیں۔ جو چند دن قبل تو بہت اونچے مقام پر تھے۔ ان کا نام رعب طاری کر دیتا تھا۔ دنیاوی وجاہت اور حشمت ان کی باندی تھی۔ مگر پھر ان "بتوں" کے چہرے سے جب نقاب الٹا گیا تو وہ پتھر کے بت تھے۔ لوگوں نے اس پتھر کو

ریزہ ریزہ کردیا۔ پھر یہ ٹکڑے بُری طرح روندے گئے۔

یہ اس شخص کی حالت ہے جو اپنی شخصیت سے اچھی طرح فائدہ نہیں اٹھاتا۔ جو ترقی کے لئے ظلم اور زیادتی کو اپنا راہ نما بناتا ہے۔ مگر موقع شناسی کا تقاضا تو یہ تھا۔ کہ ترقی کے لئے ایسے ذرایع اختیار کئے جاتے۔ جو بے ضرر ہوتے۔ کسی کی حق تلفی نہ کی جاتی۔ اور ذہنی طور پر دوسروں پر اپنی شخصیت کا اثر ڈالا جاتا۔ اخلاص اور محبت کے ذریعے دوسروں کو اپنایا جاتا۔

جو شخص دوسروں کی قربانیوں پر انحصار رکھے اور چاہے کہ وہ اُن سے بڑا بنتا ہے۔ وہ کبھی کامیاب نہ ہوگا۔ اس کی کامیابی عارضی ہوگی۔ حقیقی کامیابی اپنی قربانیوں سے حاصل ہوتی ہے۔ بھلا دوسروں کی گری ہوئی عمارتوں پر محل تعمیر کئے جا سکتے ہیں۔ ایسے محل دیرپا ہوں گے؟ اپنے بھائیوں کو دکھ دے کر اور انھیں تکلیف پہنچا کر اپنی شخصیت کا ناجائز فائدہ اٹھانا ہرگز مفید نہ ہوگا۔ ایسے شخص کا راستہ کانٹوں اور زہریلے بچھوؤں سے بھرا رہے گا۔ جو موقع ملتے ہی ڈنگ ماریں گے۔

مگر اس کے برخلاف ایسے لوگ جو خود قربانی کرتے ہیں۔ دوسروں کا حق نہیں چھینتے اخلاص اور ہمدردی کے ذریعے آگے بڑھتے ہیں۔ تو اُن کی راہ خود بخود صاف ہوتی جاتی ہے۔ ان کے مخالف بھی ان کے حسنِ اخلاق سے ان کے دوست بنتے جاتے ہیں۔

وہ طاقت جو انھیں راستہ صاف کرنے پر صرف کرنی تھی۔ وہ اب آگے بڑھنے پر صرف ہو گی۔ وہ جلد آگے بڑھ سکیں گے۔

ایسا شخص خوب جانتا ہے کہ دوسروں کو کس طرح خوش کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ کما حقہٗ ایسا نہ بھی کر سکے تو بھی اتنا ضرور ہوتا ہے کہ وہ ایسا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ کوشش ہی اسے دوسروں کی نظروں میں محبوب بنا دیتی ہے۔

متکبر اور ایسے شخص میں یہی نمایاں فرق ہے کہ دشمن دونوں کے ہیں۔ مگر ان سے سلوک کرنے کے معاملے میں اُسے ظلم اور طاقت کے ذریعے دبا تا ہے۔ دوسرا اپنے دشمن کی عداوت کو محبت میں تبدیل کرنے لگتا ہے۔ دوسرے شخص میں بھی غرور کا کچھ حصہ ضرور ہوتا ہے۔ مگر یہ غرور دوسری صفات کی آمیزش سے قابل قدر بن جاتا ہے۔ وہ اپنا ڈھنڈورا نہیں پیٹتا۔ بلکہ موقع شناسی اور حکمت عملی کے ذریعے لوگ خود بخود اس کی صفات کا چرچا کرتے پھرتے ہیں۔ شہرت اس کے در کی باندی بن جاتی ہے۔

ایک قصہ سنئے۔

"بدیع الزماں" قومی وزارت کا ایک کامیاب رکن ہے۔ وہ اونچے طبقے میں ہی مقبول نہیں۔ بلکہ ادنیٰ طبقے کے لوگ اس پر جان چھڑکتے ہیں۔ جب ہم اس شخص کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ پڑھا کرتا تھا۔ تو وہ قابل ترین طلبہ

میں سے تھا۔ سکول میں اساتذہ اور کالج میں پروفیسر اس سے پیار کیا کرتے تھے۔ وہ ذہین تھا۔ سکول اور کالج کے لئے اس کی ذات قابل فخر تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کوئی طالبعلم اس سے حسد نہ کرتا تھا۔ بلکہ وہ سب کا محبوب دوست تھا۔ سب اسے پسند کرتے ہیں۔

جب وہ زندگی میں داخل ہوا تو بھی اس کے چاروں طرف دوستوں کا ہجوم رہتا۔ جو اس کی ذہانت کو چار چاند لگا رہے تھے وہ خوب جانتا تھا کہ ترقی کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ طاقت اور ظلم کا ہے۔ اور دوسرا تحمل اور بُردباری کا۔

دوسرا راستہ اگرچہ لمبا اور کٹھن تھا۔ لیکن بدیع الزماں نے وہی راستہ اختیار کیا۔ سکول اور کالج میں بھی وہ انھیں اصولوں پر کاربند تھا۔ جن پر وہ آج ہے۔ وہاں بھی اس کے گرد لوگ جمع تھے اس کا اخلاص، پیار، اور ہر کام میں تحمل اسے محبوب بناتے گئے۔ وہ ہمیشہ ایک سچا رفیق ثابت ہوا گیا۔

اب وہ ریاست کی قومی وزارت کا وزیر ہے۔ دن بھر اس کے گھر پر ملاقاتیوں کا ایک ہجوم رہتا ہے۔ ہر قسم اور ہر طبقے کے لوگ اس کے بنگلے کے گرد نظر آتے ہیں۔ عالی مرتبت اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کا اس کے ہاں جانا تو درست، اس سے اُسے فائدہ پہنچنے کی امید ہو سکتی ہے۔ مگر ادنیٰ طبقے کے لوگ۔ بھلا ان کا فائدہ؟ ان کا فائدہ ہے اور ضرور ہے۔ ادنیٰ طبقے کے لوگ اعلیٰ طبقے کے

لوگوں کے دماغی توازن کو قائم رکھتے ہیں۔

اگر وہ صرف اعلیٰ طبقے کے لوگوں کو ہی مدعو کرتا رہے تو ایسے لوگ یہ سمجھیں گے کہ بدیع الزماں کی وزارت کا انحصار صرف ان پر ہے اُن کے مشورے اور ملاقاتیں ہی اسے قائم رکھ سکتے ہیں۔ لیکن جب اعلیٰ طبقے کے لوگ وہاں ایسے لوگوں کو بھی پاتے ہیں۔ جن کا تعلق عوام سے ہے۔ تو اُن کا دماغی توازن قائم رہتا ہے' وہ خوب جانتے ہیں کہ جب تک عوام کی ہمدردیاں وزارت کے ساتھ ہیں۔ ان کی مخالفت اُسے چنداں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

وزیر بدیع الزماں کے لئے اب دونوں طبقے ممد ومعاون ثابت ہونے لگے ہیں۔ اگر ایک طبقہ یہ سمجھ کر اُن کے ساتھ ہے۔ کہ وزیر کی پشت پر رائے عامہ ہے۔ اس کے بغیر وہ بھی نہیں بڑھ سکتے تو دوسرا طبقہ اس لئے خوش ہے۔ کہ انھیں نوازا جاتا ہے۔ ان کی عزت افزائی ہوتی ہے۔

اب وہ عوام کے دلوں پر حکمران ہے۔ وہ جو کام کرانا چاہتا ہے۔ صرف اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ اشارہ ایک حکم سے زیادہ اثر رکھتا ہے۔ ہر کوئی یہی چاہتا ہے کہ وہ اُسے خوش کرے اُسے خوش کرنے میں ہر کوئی دوسرے سے رشک کرتا ہے پھر یہ لوگ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ کام کرتے ہیں تاکہ اس کی نگاہوں میں مقبول ہو۔ بغیر کچھ کیے اس کے کام ہونے لگتے ہیں۔

اس کے میز پر ہمیشہ سرخ پھولوں کا ایک گلدستہ رکھا رہتا ہے یہ اس کا ایک دوست بھیجتا ہے۔ کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ وزیر صاحب کو سرخ پھولوں سے رغبت ہے۔ یہ تحفے اُسے اپنے مذاق کے مطابق آتے رہتے ہیں۔ لوگ اس کے مزاج کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ اور اس کے مطابق اُسے خوش کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن یہ سب کچھ یونہی نہیں ہوگیا۔ اس کے لئے بدیع الزماں کو بہت سی قربانیاں کرنا پڑی ہیں۔ یہ مقام حاصل کرنے کے لئے اُس نے اپنے جذبات کا بارہا خون کیا ہے۔ یہ قربانیوں کا پھل ہے جو اب اسے مل رہا ہے۔ اس نے ہزاروں لوگوں کے دکھ سنے اُن کی تلافی کیلئے کوشش کی۔ اس کام کے لئے اسے تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ وہ چاروں طرف سے مشکلات میں گھر گیا۔ مخالفین نے اسے ناکام بنانے میں سارا زور لگا دیا۔ پریشانی اس کے سر پر منڈلانے لگی۔ مگر وہ مرد میدان بن کر ان مشکلات میں بھی مسکراتا رہا اس کی یہ مسکراہٹ دشمنوں پر بجلی بن کر گرتی ہے۔ دوست خوش ہیں۔ ان کا محسن مشکلات سے گھبراتا نہیں۔ بلکہ مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ وہ بھی اس کی امداد میں کوشاں رہتے ہیں۔ اب وہ حوادث کے مقابلے میں اکیلا نہیں۔ بلکہ ان کے ساتھ اس کے ہمدردوں کی ایک تعداد ہے۔

مقابلہ ہو رہا ہے، خاموشی سے، دشمن نہیں جانتا کہ اس کے مخالف کے ساتھ کتنے لوگوں کی اخلاقی ہمدردیاں شامل ہیں۔

بدیع الزماں نے اپنے لئے ایک مقام سوچا تھا۔ اس نے اُسے حاصل بھی کرلیا۔ وہ کامیاب شخصیت ہے۔ مگر اس مقام کے حاصل کرنے کے لئے اس نے جو راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ کتنا طویل تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ قدم بڑھایا۔ دشواریاں کم ہوتی گئیں۔ رکاوٹیں صاف ہوئیں۔ اور پھر آخر کار وہ منزلِ مقصود تک پہنچا۔ وہاں تک ظلم اور تعدی سے بھی پہنچا جاسکتا تھا۔ مگر وہ پہنچنا عارضی تھا۔ اور اس کا انجام ذلت اور خواری ہوتا۔ مگر یہ پہنچنا۔ اس کے ذریعے وہ نہ صرف بلند مقام پر سرفراز کیا گیا۔ بلکہ اسکی ہزاروں انسانوں کے دلوں پر حکومت ہے۔ اس کے ادنیٰ سے اشارے کو حکم جانتے ہیں۔

ترقی کرنے کے لئے یہی راستہ خوب ہے۔ آگے بڑھتے جاؤ۔ مگر جنھیں تم نے پیچھے چھوڑا ہے۔ انھیں کبھی ناراض ہونے کا موقع نہ دو۔ اُن کے دلوں کو حسد سے پاک رکھو۔ حقیر سے حقیر انسان کو بھی ناراض نہ کرو۔ یہی حقیر انسان ایک دن تمھارے دشمن کا طاقت در بازو بن سکتا ہے۔ اپنے دلی راز کو دل میں رکھنے کے لئے قوت برداشت پیدا کرو۔ ہر کسی کو رازداں نہ بناؤ۔ دوستوں کا امتحان نہ کیا کرو۔ یہ غلطی ہے۔ سراسر غلطی بلکہ دوستوں کے ساتھ تم بھی اُن ایسا بننے کی کوشش کرو۔ انھیں اپنے معیار پر نہ جانچو۔ بلکہ جو وہ چاہیں۔ تم خود بنتے جاؤ۔ اس طرح تم کسی سے بھی الگ نہ ہوگے۔ نہ کوئی تم سے نفرت کرے گا۔

چند رکاوٹیں

بار ہا ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ ہم زندگی کی کشمکش میں ان تمام اصولوں پر کاربند رہتے ہیں۔ جن کا ذکر ان اوراق میں ہو چکا ہے۔ مگر اس کے باوجود کامیابی ہم سے کوسوں دور رہتی ہے۔ اس کا کہیں نام ونشان تک نظر نہیں آتا۔ یہ بھی زندگی کا ایک پہلو ہے۔ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ گھبرانا ہمت ہارنا ہے۔ اگر ہم نے ہمت ہار دی تو ہماری شخصیت کو اس سے ایسا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے جس کی تلافی مشکل سے ہو سکے گی

اگر زندگی کسی ایسے مقام پر آکر رک جائے۔ تو ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ نفسیاتی لمحہ جو کامیابی کے لئے کنجی کا حکم رکھتا ہے ابھی نہیں آیا۔ استقلال سے کام کئے جانا ضروری ہے۔ استقلال اور یقین مل کر وہ لمحہ ضرور لے آئیں گے۔

زندگی ایک سمندر ہے۔ جس کی تہ میں کئی ٹیلے اور ریت کے

تودے پوشیدہ ہیں۔ سطح آب پر طوفان اور طلاطم آتے رہتے ہیں مگر پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ سمندر کا پانی بالکل ساکن ہو جاتا ہے۔ وہ سماں اتنا پیارا اور حسین ہوتا ہے۔ کہ اس سے روح کو سکون اور آنکھوں کو ترادت پہنچتی ہے۔ اس وقت وہی سمندر اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ جہازوں کو اپنے سینے پر لئے ہوئے کھڑا ہوتا ہے۔ امن اور سکون کے ساتھ ایک تجربہ کار ملاح طوفان اور ریلوں کے باوجود بد دل نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ اس طوفان کے بعد سطح آب پر سکون کا دور دورہ ہوگا۔ وہ اس زمانے کے لئے موجوں کے تھپیڑے کھاتا ہے۔

زندگی اگر سمندر ہے تو ہمیں ملاح بن کر اس وقت کا انتظار کرنا چاہئے جب طوفان تھم جائے گا۔ اور سمندر کے غصے کی ساری جھاگ پھر پانی میں تحلیل ہو کر اسے پانی بنا دے گی۔

ہماری زندگی کا نصب العین بالکل ایک ان دیکھے دیس کی مانند ہے۔ جو سمندر کی وسعتوں کے اُس پار ہے۔ اس دیس کو ہم نے کبھی دیکھا نہیں۔ ان حالات میں ہمیں کولمبس کا سا دل جگر پیدا کرنا چاہیئے۔ جب کولمبس کے سارے ساتھی سمندر کی لہروں سے لڑتے لڑتے تھک گئے تو انھوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ اُن کی ہمتیں پست ہو چکی تھیں۔ مایوسی ان کا راستہ روک رہی تھی۔ وہ سب کے سب دل چھوڑ بیٹھے۔ مگر کولمبس ایک ایسا فرد تھا جو مایوس نہ ہوا۔ اُسے ان دیکھے دیس میں پہنچ جانے کا پورا یقین تھا۔ اس کی جرأت نے دوسروں کو بھی مجبور کیا کہ

وہ بھی اس کے ساتھ سفر جاری رکھیں

پھر یکا یک ایک لمحہ آن پہنچا۔ انھیں افق نظر آ گیا۔ ان دیکھا دیس ان کے استقبال کے لئے چشم براہ تھا۔ وہ کامیاب ہوا اس کے ساتھیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ کولمبس آج دنیا کا عظیم الشان انسان ہے۔

ہم بھی کولمبس کی طرح شخصیت کے لئے زندگی کے سمندر میں روانہ ہو چکے ہیں۔ ہماری راہ میں ہمارے ساتھی روک ڈال رہے ہیں۔ انکی بغاوت ہمیں مایوس نہ بنا دے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم بھی کولمبس کی طرح جرأت سے کام لے کر آگے بڑھتے جائیں۔ ہماری جرأت دوسروں کو مجبور کر دے کہ وہ ہماری ساتھ ساتھ چلیں۔ ہمت، استقلال اور یقین کی ضرورت ہے۔ یہی شخصیت کے جوہر ہیں۔ ان سے کام لے کر ان دیکھے دیس تک پہنچنا ہمارا فرض ہے۔ اس کشمکش میں ہماری ذرا سی چوک شاید ہمیں سیدھی راہ سے دور لے جائے۔

جب تک افق نظر نہیں آتا۔ آپ لہروں سے کھیلتے ہوئے بڑھتے رہیں۔ یہاں تک کہ یاس امید میں تبدیل ہو کر زمین کی ساری وسعتیں آپ کے سامنے لا رکھے۔ یقین کو محکم کرنے کے لئے سعی کیجئے۔ یہ کامیابی کے محل کی محراب ہے۔ جس کے بغیر عمارت نہیں ٹھہر سکتی۔

کبھی آپ نے برفانی چوٹیوں پر سیاحوں کو چڑھتے دیکھا ہے۔ اُن کے آگے ایک راہنما ہوتا ہے اور ایک رسہ اوپر سے نیچے بندھا رہتا ہے۔ رہنما کی ہدایت اور رسے کے سہارے سے وہ لوگ بلندیوں

کی طرف چڑھتے ہیں۔ اس رہنما کو اگر یقین سے تشبیہ دی جائے اور رسے کو استقلال سے تو اس مثال کی اہمیت زیادہ واضح ہو جائے گی۔ جب یہ دونوں طاقتیں مل جائیں۔ تو اُن سے وہ قوت پیدا ہوتی ہے۔ جو زندگی کی ہر ناکامی کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ جہاں ہم کامیابی کو پاتے ہیں وہیں ہمیں ان دونوں طاقتوں کا امتزاج بھی ملتا ہے۔ تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھیے۔ تو ہمیں ان دونوں قوتوں کے کرشمے نظر آئیں گے۔ محیر العقول واقعات بھی انھیں سے پیدا ہوتے ہیں۔

ان دونوں طاقتوں کو اپنا لیجئے اور ان کے ذریعے زندگی کے راستوں پر بے خطر چلتے جائیے۔ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

حرفِ آخر

زندگی کی کہانی کے متعلق ہم نے ان مختلف اجزا کا ذکر کیا ہے۔ جن سے یہ کہانی بنتی ہے اور مقبول ہوتی ہے ان اجزار کے ذریعہ ہی شخصیت کو چمکایا جاتا ہے۔ اس چمک کو پیدا کرنے کے لئے کبھی کسی دوسرے کی نقل نہ کی جائے۔ دوسروں کی خوبیوں کو لے کر انھیں اپنے رنگ میں ڈھال لینا ہی خوبی ہے آپ کا اپنا ایک نمایاں رنگ ہو۔ تاکہ اس سے آپ کی شخصیت میں انفرادیت پیدا ہو سکے دوسروں کی نقالی کرنا آپ کی ذات کو دوسروں کی ذات میں مدغم کر دے گا۔ آپ کے اندر جو قوت تخلیق اور جدت پسندی ہے وہ لٹ جائے گی۔

اس دنیا میں کوئی دو افراد ایک ایسے نہیں ہوتے۔ قدرت نے ہر انسان کو ایک علٰحدہ سانچے میں ڈھالا ہے مگر ہم لوگ نقالی کے ذریعہ ایک ایسی عادتیں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ قانون فطرت کے خلاف ہے۔ ہمیں چاہئے کہ جس طرح قدرت نے ہمیں ایک علٰحدہ ذات دی ہے ہم

اسی طرح اُسے قائم رکھیں۔ مگر برا ہو فیشن کا وہ ہماری انفرادیت کے لئے سم قاتل ہے ہم اس سے بھاگ تو نہیں سکتے۔ ہاں اتنا کر سکتے ہیں کہ ہم اس کے اثر سے کم از کم متاثر ہوں۔

جدت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم دوسروں کے مذاق کے مطابق اپنے آپ کو نہ بنائیں۔ بلکہ اپنی شخصیت کو ایسے ہر ایک اثر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ ہر ایک بات کا خود موازنہ کرنے کی عادت پیدا کریں۔ دوسروں کے بنائے ہوئے معیاروں پر زندگی کی اقدار کو نہ ناپیں۔

اگر ہم میں سے کوئی شخص متناقض باتیں کرنے والا ہو اور دوسرا بالکل کورا۔ تو اول الذکر شخص دوسرے سے بہرحال بہتر ہے۔ کم از کم اس کی شخصیت تو ہے اس کے لئے مواقع موجود ہیں وہ اپنی رائے سچائی کے مطابق تبدیل کر سکتا ہے۔ مگر جو شخص شخصیت سے بالکل عاری ہے۔ وہ لا علاج ہے۔

اپنے تئیں آپ تجزیہ کرنے کی عادت ڈالیں۔ اپنی ذہانت کو تربیت کرنے کے لئے اپنے تجربات اور تجزیئے کا مقابلہ پہلے لوگوں کے خیالات سے کرتے رہا کریں۔ تاکہ آپ پر آپ کی خامیاں عیاں ہو جایا کریں۔ زندگی میں جدت پیدا کرنا زندگی ہے۔ ورنہ زندگی ایک کولھو کا بیل بن کر رہ جائے گی۔ جرأت کے ساتھ ہر روز آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ شخصیت اور جدت پسندی آپ کو عام لوگوں سے بلند کر دے گی۔

پھر یاد رکھئے تحمل سے کام کیجئے۔ دوسروں سے حسن سلوک اور

اپنے اندر یقین کامل پیدا کیجئے۔ شخصیت جب بن جائے۔ تو پھر اُسے گرنے نہ دیں۔ یہ کام پہلے سے زیادہ مشکل ہے۔ شخصیت بنائی جا سکتی ہے۔ مگر بننے کے بعد اسے برقرار رکھنا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ اس سے اور زیادہ مشکل کام شخصیت سے کام لینا ہے۔ اس کا انحصار صرف آپ کی ذات پر ہے۔ آہستہ آہستہ کوشش کرنے سے یہ حاصل ہوگا۔ اپنی شخصیت کو دوسروں سے منوانا حکمت عملی چاہتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ لوگوں سے ملتے رہیں۔ ان کی صحبت میں بیٹھیں۔ اپنے تعلقات وسیع کریں خلوت پسند کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔ زندگی بسر کرنے کے لئے اچھے لوگوں کا سہارا تلاش کریں۔ تاکہ آپ کی شخصیت کی تکمیل میں وہ مدد دی سکیں۔ اور پھر زندگی کے سمندر میں قسمت کے جہاز کے خود ملاح بن کر ان دیکھے دیس کو ڈھونڈھ نکالیں۔

کردار

مختلف اجزار

باتیں ہم سب کرتے ہیں۔ مگر ہم میں سے کتنوں کی باتیں ایسی ہیں جو سوچ سمجھ کر کی جاتی ہیں۔ اکثر تو بات کیے بنا رہ نہیں سکتے جو منھ میں آیا کہہ ڈالا۔ خواہ بعد میں پچھتانا ہی پڑے زبان کا زخم آج تک کسی نے مٹتے نہیں دیکھا۔ تلوار کا زخم چند دن رہتا ہے۔ بات کا زخم، ذرا سی بات کہہ دی اور عمر بھر کے لیے تعلقات ٹوٹ گئے۔ مگر وہ لوگ جن کی باتیں میٹھی اور اچھی ہوتی ہیں۔ انھیں ہم کتنا پیار کرتے ہیں۔ وہ ہمارا دل موہ لیتے ہیں اور اپنا گرویدہ کر لیتے ہیں۔ سوچ بچار کی بات بڑی بڑی مشکلات سے بچا لیتی ہے۔

وہ لوگ جن کی باتیں اچھی ہوتی ہیں جن کی باتوں پر ہر کوئی چلتا ہے۔ ان کے پاس صرف ایک جوہر ہوتا ہے اور وہ سمجھ بوجھ ——— سمجھ بوجھ کی بات ہی انھیں ہمارے دلوں میں جگہ دلاتی ہے۔

سمجھ بوجھ ہے کیا؟ یہی کہ کسی بات جاننے کی کوشش کرنا۔ جو بات بھی ہو اسے سیدھے طور پر اور سادگی سے سمجھنا اور بتانا۔ ایسا کرنا آسان نہیں۔ بلکہ یہ ایک شوق اور محبت چاہتا ہے۔ سچائی ہے۔

ہمارے تمام خیالات ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں۔ جب ہم ان کو سیدھے طور پر اور سادگی سے سمجھنا چاہتے ہیں تو ان میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں رہتا۔ بلکہ یہ خیالات دوسرے کے دل میں گھر کر لیتے ہیں۔

اگر ہم میں فیصلہ کرنے کی قوت کمزور ہے۔ ہمیں ذرا ذرا سی بات سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ تو اس کا علاج سمجھ بوجھ میں ہی ہے۔ خوف تو اس سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔ بے یقینی کی منزل سے نکل کر ہم ایک متعین راستے پر گامزن ہو جاتے ہیں

سمجھ بوجھ چند نپے تلے اصول یاد کر لینے کا نام نہیں۔ بلکہ یہ ماحول اور تعلیم کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ بعض باتیں جو مشرق میں اچھی اور قابل فخر خیال کی جاتی ہیں۔ مغرب ان پر ہنستا ہے۔ تمسخر اڑاتا ہے۔ مشرقی مذاق بالکل جداگانہ ہے۔

مغربی ماحول کا اثر وہاں کی طبائع پر اور ہوتا ہے۔ پھر مرتبے اور طبقے کے لحاظ سے بھی سمجھ بوجھ میں فرق پیدا ہو جاتا ہے جب کبھی ایسا فرق پیدا ہو جائے تو سمجھ بوجھ کا کام یہی کہ وہ ماحول کے مطابق جانچ کرے اور پھر اصول کو پیش نظر رکھ کر اس فرق کو مٹا دے۔ ایک مشرقی حکیم کا خیال ہے کہ سمجھ بوجھ خیالات کی مشکلات کے حل کرنے کا فن ہے۔ نہ کہ اور زیادہ الجھنیں پیدا کرنے کا ۔۔۔ یہ بات بالکل درست ہے خیالات میں الجھن پیدا کرنے سے ہمیں زندگی میں آرام نہیں ملتا۔ بلکہ ذہنی پریشانی کا باعث بنتا ہے۔ جب کبھی فکر میں کنجلک پڑ جائے اور ہم غور و خوض اور سمجھ بوجھ سے کام لیکر اس کا حل تلاش کر لیں۔ تو کتنی روحانی مسرت ہوتی ہے زندگی آسان معلوم ہونے لگتی ہے۔

سمجھ بوجھ بصیرت (نکتہ فہمی) کا جزو اول ہے۔ اس کے بغیر ہم کسی مسئلے یا مضمون کی اہمیت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ کسی اچھے خیال کی تعریف نہیں کر سکتے۔ اور نہ ہی اس کا صحیح اور قابل تعریف حل تلاش کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور بھی لازمی جزو ہے اور وہ ہے اظہار خیال میں درستی (accuracy) کیونکہ اس کے بغیر آپ دلکی بات کو اچھے طریق سے ادا نہیں کر سکیں گے

اب ذرا اور زیادہ گہری نگاہ سے اس صفت کا مطالعہ کریں۔ ہمیں معلوم ہوگا کہ اس کے کئی اجزا ہیں۔ پہلا جزو ذہن سے

(Reason) ہے۔ اس کے بعد میانہ ردی (Moderation) ہے ان کے ساتھ تیز فہمی کا ہونا اور بھی مفید ہوگا۔ استقامت کی صفت ان سب کے لیے ایک سہارے کا کام دے گی۔ اس سے آگے بڑھئے تو دانش مندی آتی ہے۔ تاکہ ہم دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس کے علاوہ بھی بعض اور صفات ہیں۔ مگر ان کی حیثیت ثانوی ہے۔

آئیے اب ذرا ان اجزا کا بھی جائزہ لے لیں۔ صحت مند خیالات کے لیے فہم ایک لازمی جزو ہے۔ تاکہ انھیں اس کسوٹی پر پرکھا جا سکے۔ فہم کا استعمال یہ ہے کہ ہم خیالات کی معمولی تفصیلات پر بھی کافی غور کریں۔ تاکہ ہمیں چیزوں کے آپس میں تعلق قائم کرنے کا فن آ جائے۔ یہی وہ طریقہ ہے۔ جس سے ہم واقعات میں تمیز کر سکتے ہیں۔ اور پھر ان کے بارے میں اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اسی کے ذریعہ ہم میں وہ عادت پیدا ہوتی ہے۔ جس سے ہم کسی چیز کو اپنا کر لیتے ہیں اور کسی کو چھوڑ کر دور رہیں زندگی اس کے بغیر ایک اتھاہ تاریکی میں گھری رہتی ہے۔ ایسی تاریکی جس میں راستہ گم ہو جاتا ہے۔ پھر فہم کی روشنی ہمیں اسی راستہ سجھاتی ہے۔ جو لوگ اس روشنی سے محروم ہیں۔ وہ اندھیرے میں ہی ٹھوکریں کھاتے ناکام عمر برباد کر جاتے ہیں۔ ان کی راہ میں کس قدر رکاوٹیں ہیں۔ وہ جان ہی نہیں سکتے۔ اندھیرے میں، ذراسی آہٹ انھیں خوفزدہ کر دے گی۔ معمولی سا سایہ ان کے ذہن پر کسی دشمن کا سراپا بن کر ان کی روح کو کانپنے پر مجبور کر دیگا۔

یہ موہوم خدشات ان کے لیے زندگی اجیرن کر دیں گے۔

زندگی ایک ایسا بیاباں ہے۔ جس کی وسعتوں کا اندازہ نہیں۔ اور جس میں قدم قدم پر گڑھے ہیں۔ اگر کوئی چاہے کہ وہ فہم کی روشنی کے بغیر ان گڑھوں کو تلاش کرے گا تو یہ اس کی خوش فہمی ہو گی۔ وہ شخص کسی ایک گڑھے میں گر کر منہ کی کھائے گا۔

اس کی دوسری مثال سراب سے بھی دی جا سکتی ہے۔ دور سے ہمیں یہ سراب ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا ہے۔ ریت پانی بن کر حقیقت کو دھوکا دیتی ہے اور پھر جب ہم پیاس بجھانے کے لیے نزدیک پہنچتے ہیں تو حقیقت تلخ ہو کر حلق میں کانٹے چبھونے لگتی ہے۔ کاش ہم نے مایوس ہونے سے قبل ذرا زیادہ غور سے اس سراب کا اندازہ کیا ہوتا جو ہمیں مایوس ہونے سے بچا لیتا۔

فہم کی تعریف اب ان مثالوں کی روشنی میں یوں کی جا سکتی ہے کہ کسی فعل کے کرنے سے پہلے اسے ہر پہلو سے جانچنا اور اس جانچ پڑتال کے بعد اسے کرنا یا ترک کر دینا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ فہم کسی فعل کو پورے شعوری اور قوتِ ارادی کے ساتھ کرنے کا نام ہے۔ اور ایسا کرنا سمجھ بوجھ کا ایک اہم ترین جزو ہے۔ آپ اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیں۔ اسی اصول پر ہم آئندہ بحث کریں گے فہم کے بغیر سمجھ بوجھ ایک بیکار شے ہے۔

اب میانہ روی کو لیجئے۔ اسے دوسرا درجہ دیا جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کی اہمیت فہم سے کم نہیں۔ اس کے بغیر ہم

اصل حقیقت کو نہیں پہنچ سکتے۔ ہماری طبیعتوں میں ہنگامہ پسندی شورش اور جلد بازی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ بات کا بتنگڑ بنا دینا ہمارا روز کا معمول ہے۔ مگر یہ میانہ روی کا کمال ہے کہ طبیعت کے اس رجحان کو قابو میں لاکر ہمیں صحیح راستہ پر گامزن کرتی ہے۔

آپ ایک باغ کی سیر کے لیے نکلے ہیں۔ جونہی آپ باغ کے قریب پہنچے۔ آندھی اور طوفان نے آپ کو گھیر لیا۔ سارا باغ اس کی لپیٹ میں آگیا۔ درخت ہل رہے ہیں پرندے پریشان ہیں۔ ٹہنیاں خمیدہ ہو ہو جاتی ہیں۔ آندھی کا شور۔ پتوں کی سائیں سائیں۔ کیا آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ باغ کیسا ہوگا۔ خوبصورت پھول، حسین اور قدآور درخت سرد چمن" سبز سبز پتے چہچہانے والے پرندے۔ سکون، یہ سب کچھ کہاں گیا۔ اب تو چاروں طرف آندھی اور جھکڑ ہے۔ جس سے آپ کو باغ تو کیا خود اپنا ہوش نہیں رہا۔

ایک اور واقعہ سنئے۔ ایک دن ایک شہزادے نے صبح ہی صبح اپنے کمرے میں لیٹے لیٹے اپنے دو نوکروں سے سوال کیا کہ باہر موسم کیسا ہے۔ سردی کے دن تھے۔ اس کا کمرہ پردوں سے بند کیا گیا تھا۔ اس نے ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کیا کہ وہ شیشے میں سے دیکھ کر جواب دیں۔ کھڑکی میں کئی رنگوں کے شیشے لگے ہوئے تھے۔ پہلے نوکر نے ایک شیشے میں سے باہر دیکھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ سورج کی حسین کرنیں باغ کے پھولوں اور ٹہنیوں سے کھیل رہی ہیں۔ نیلا آسمان آج سب سے زیادہ حسین نظر آرہا تھا۔

اس کی طبیعت کے رجحان اور شیشے کے رنگ نے اس پر اچھا اثر کیا۔ اسے موسم نہایت حسین اور خوشگوار معلوم ہوا۔

مگر دوسرا۔ اس نے اندھے شیشے میں سے دیکھا۔ باہر کیا تھا۔ اندھیرا ہی اندھیرا۔ ہاں اسے شیشے پر شبنم کے چند قطرے معلوم ہوئے اور بس۔ وہ کام کاج سے تھکا ہارا طبیعت سُست ابھی ابھی جاگا تھا۔ اس نے موسم کا اندازہ یہی لگایا کہ باہر کہر ہے سورج کا کہیں نام ونشاں نہیں۔

یہ کہانی ہمیں افراط اور تفریط کا حال بتاتی ہے۔ دونوں ہی غلط تھے۔ ایک نے بات کو بڑھایا۔ دوسرے نے گھٹایا دونوں ہی حقیقت سے دور چلے گئے۔ اگر ہم بھی زندگی کی حقیقت کو غلط بنیادوں پر استوار کرنے کا اقدام کریں گے تو یہی عمارت بنے گی۔ اور ہم عمر بھر اس کی سزا بھگتیں گے۔ میانہ روی ہی وہ صحیح راستہ ہے۔ جو ہمیں منزل مقصود تک لے جاتا ہے۔ اور سمجھ بوجھ کا جزوِ لازم۔

تیز فہمی ایک ایسا جوہر ہے۔ جو زیادہ تر مشق سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ جوہر پورے طور سے کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی اس کو بڑھانے کے لیے قوت ارادہ اور ضبط کی ضرورت رہتی ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے ہمیں ہونے والے واقعات کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ ہم معلوم کر سکیں کہ ایسا کیوں ہوا۔

بعض اوقات معمولی باتوں سے اہم واقعات رونما

ہو جاتے ہیں اس لیے یہ تیز فہمی کا کام ہے کہ وہ ایسے معمولی واقعات کو کرید ے اور ان سے اندازہ لگائے۔ یہ کام ہمت اور استقلال چاہتا ہے۔

اگر ہم اپنے ارد گرد نگاہ ڈالیں تو ہمیں مطالعہ کے لیے ہزاروں واقعات مل سکتے ہیں۔ گھر کی باتیں۔ محلے کے جھگڑے شہر کے قصے۔ سیاسی حالات۔ ملکی معاملات، بھلا کیا کچھ نہیں ہے۔ ان میں سے آپ اپنی پسند کے مطابق چن لیجئے۔ اور اس پر غور کیجئے۔ نتائج کتنے اچھے ہوں گے۔

اگر آپ تیز فہمی کی مشق کرنا چاہتے ہیں تو پھر ایسا معاملہ لیجئے جس میں آپ کا کسی طریق سے بھی تعلق نہ ہو۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ آپ بغیر کسی قسم کی رعایت کے اس معاملہ پر اچھی طرح سے تفکر کر سکیں گے۔ اور اس کا نتیجہ بہت ہی اچھا ہوگا۔ جذبات کو اپنی سوچ کی راہ میں حائل نہ ہونے دیں۔ اس سے الجھاؤ پیدا ہوگا۔ تفکر میں وہ صراحت نہ رہے گی۔ آپ کا فیصلہ مستحکم بنیادوں پر نہ ہوگا۔ اور اس سے اصل مقصد یعنی سمجھ بوجھ کو نقصان کا احتمال ہوگا۔

اب استقلال کا درجہ آتا ہے۔ استقلال درحقیقت مذکورہ بالا ساری خصوصیات پر لگاتار عمل پیرا رہنے کا نام ہے یہ کام حقیقتاً بہت مشکل ہے۔ اس کا منبع فہم ہے۔ میانہ روی کے بغیر استقلال قائم نہیں رہ سکتا تیز فہمی بھی اس کے قیام کے لیے ضروری ہے۔ تاکہ استقلال پر رہنے کے لیے اپنی تسلی

بھی رہے۔

ایک لوہے کے ٹکڑے پر لگاتار ایک جگہ ہتھوڑے سے ضربیں لگاتے جائیں تو آخرکار وہ حصہ باریک ہو جائیگا اور یہی استقلال کا حال ہے۔ اس کے ذریعے مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔

استقلال اور تحمل آپس میں متعلق ہیں۔ مگر ان کو آپس میں غلط ملط کرنا درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ استقلال کا سرچشمہ معقولیت اور فہم ہیں۔ ان کے ذریعے صرف ایک فعل ہی سرزد نہیں ہوتا۔ بلکہ کئی افعال لازم و ملزوم ہو کر استقلال کا عمل پیدا کر لیتے ہیں۔ اس کی راہ میں جس قدر دوسرے خیالات آئیں گے وہ خود بخود مٹتے جائیں گے۔ اس کا کام ہمیشہ ایک مقررہ منزل کی طرف لے جاتا ہے۔

آخر میں ہم دانشمندی کا ذکر کریں گے۔ اس کے ذریعہ ہم تجربات کا تجزیہ کر لیتے ہیں۔ یہ نہ ختم ہونے والا سبق ہے عمر کے ساتھ ساتھ علم بڑھتا جاتا ہے۔ یہ سمجھنا بھی غلطی ہے کہ صرف بڑھاپا ہی دانشمندی کا گہوارہ ہے کیونکہ اگر ہم جوانی میں اپنی حماقتوں سے باز نہ رہ سکے تو بڑھاپے میں فائدہ کیا۔ تب تو قویٰ کے مضمحل ہو جانے سے بات خود بخود درست ہو جائے گی۔ پھر یہ جوہر بیکار ہوگا۔ جس عورت کے ہاتھ ہی نہیں اس کے لیے سونے کے کنگن فضول ہیں۔ اس لیے جوانی میں ہی دانشمندی کو اپنا رہنما بنانا ضروری ہے۔ دوسروں کے تجربات سے

فائدہ اُٹھا کر اسے حاصل کرنا چاہیے۔ اگر جوانی انھیں اس طرف آنے سے روکتی ہے تو بڑوں کا کام ہے۔ کہ دھیرے دھیرے انھیں اس راہ پر لائیں۔ وہ عمر کے تقاضے سے زندگی کے نشیب و فراز کو زیادہ سمجھتے ہیں۔ محض بڑھاپے کو دانشمندی کے لیے خاص کرنے کا ایک اور نقصان یہ ہوتا ہے۔ کہ بڑھاپا کبھی جوانی کے جذبات کو دوبارہ محسوس نہیں کر سکتا۔ وہ صرف انھیں یاد کر سکتا ہے۔ محض ایک دھندلا سا خاکہ ذہن میں کھینچ سکتا ہے۔ جذبات میں زوال آجانے سے یادداشت پر بھی اثر پڑتا ہے۔ پھر شباب میں وہ جزئیات جو اس کی جان ہوتی ہیں۔ بوڑھا دماغ بھول چکا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اسے دانشمندی کے لیے خاص کر دینا درست نہیں۔ شاید ہماری یہ بات بوڑھوں کو بُری لگے۔ مگر حقیقت سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔

اس لیے ہم پھر ایک بار کہیں گے کہ عمر رسیدہ لوگوں کی دانشمندی قابل قدر ہے۔ بشرطیکہ اسے جوانی میں ہی حاصل کر لیا جائے۔ تاکہ ہم اس کے ذریعے زندگی کو کمال تک پہنچا سکیں۔

یہ مختلف اجزاء جن سے سمجھ بوجھ کی تشکیل ہوتی ہے۔ ان پر عمل کرنے سے ہماری فکر ایک ایسا راستہ اختیار کرتی ہے۔ جسے صراط مستقیم کہا جاتا ہے۔ اس پر عمل کرنا زندگی کی دشواریوں کو بہت کم کر دیتا ہے۔

تجربات کے ذریعے دانشمندی حاصل کرنے والا انسان سمجھ بوجھ کے سہارے مشکل سے مشکل مقام سے بھی بچ کر نکل جاتا ہے۔ اور یہ اجزاء مل کر انفرادی طاقت اور ہمت کا باعث بنتے ہیں۔

سکون

بھلا ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اپنے
جذبات پر قابو ہے۔ بعض اوقات ہم مجبور ہو جاتے
ہیں کہ جذبات کی رو میں بہہ جائیں۔ اس لیے کسی مشکل کا
حل محض سوچ بچار پر منحصر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر ہم چاہتے
ہیں کہ اپنے افعال پر قابو پالیں۔ یا ہم اس بات کا تہیہ
کرلیں کہ ہم اپنے افعال پر قادر ہوں گے تو اس کے لیے
ضروری ہے۔ کہ ہم قوتِ فیصلہ کے ساتھ ساتھ اپنے کردار
کو بھی بروئے کار لائیں۔
جذبات کا معدوم ہونا، امر محال ہے۔ لیکن اگر یہ

جذبات اس حد تک ہم پر مسلط ہو جائیں کہ ہم خود پشیمان ہوں۔ تو پھر اس صورت میں ہمارے لیے لازمی ہے کہ ہم اپنے آپ کا محاسبہ کریں۔ اس عادت کو روکنے کا آسان طریق یہ ہے۔ جس فعل کے لیے ہمیں جواز ڈھونڈھنا پڑے ہم اسے نہ کریں۔ ہمارے اعمال کسی جذبہ کی ایک شکل ہوتے ہیں۔ اور یوں وہ جذبہ تسکین پاتا ہے۔

ہم میں سے کمزور طبیعت کے لوگ اس اصول پر پورے نہیں اترتے۔ وہ ہیجان اور سنسنی خیزی کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ جذبات کی بھول بھلیوں میں ایسے پھنستے ہیں کہ انھیں نکلنے کی راہ ہی سجھائی نہیں دیتی۔ ان کا ہر فعل انھیں اور زیادہ سراسیمہ کر دیتا ہے اور وہ عمر بھر بھٹکتے رہتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ ان جذبات کا مقابلہ کرنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔ اور بعض حالات میں تو شاید ناممکن ہو۔ پھر جب یہ جذبات ایک عادت بن جائیں تو ان کا روکنا اور بھی دشوار ہوتا ہے۔ مگر ان جذبات کا تصادم جب سمجھ بوجھ اور اخلاق سے ہو تو یہ جذبات اپنے اظہار کو دبا لیتے ہیں۔

ہم مذکورہ بالا بیان کی ذرا تشریح کرتے ہیں۔

فرض کیجئے میں کنجوس ہوں۔ جب میرے گھر میں روپیہ خرچ کیا جائے گا تو میں دیکھوں گا۔ مجھے دکھ محسوس ہوگا۔ میں جذبے کے ماتحت کڑھنے پر مجبور رہوں گا۔

لیکن اس کا علاج - بالکل سہل ہے۔ اگر میں ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرنے لگوں کہ روپیہ کا مقصد کیا ہے؟ خرچ کرنا میرا روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ اس سے میرے خاندان کی بقا وابستہ ہے۔ میں ذرا اور سوچوں گا۔ تو مجھے خود بخود اپنے کنجوس ہونے پر ندامت ہوگی۔ اور آخر کار میں اپنے کردار کی مضبوطی سے اس جذبے کو کفایت شعاری میں تبدیل کر سکتا ہوں۔

اسی طرح شاید ہی کوئی انسانی جذبہ ہو جسے تھوڑی سی سوچ بچار اور کردار کے سہارے بری حالت سے اچھائی کی طرف نہ مائل کر لیا جائے۔

کنجوسی اور کفایت شعاری ایک ہی جذبے کے دو رخ ہیں۔ ایک رُخ کتنا قابلِ نفریں ہے۔ اور دوسرا کتنا قابلِ تعریف۔ کنجوس انسان انسانیت کے درجے سے گِر کر ایک حیوان بن جاتا ہے۔ مگر کفایت شعاری ایک ایسا جوہر ہے۔ جس کے باعث ترقی کے راستے کھلتے ہیں۔

ایک جذبہ روح کے لیے ناسور ہے۔ اس سے ہمارا ضمیر ایک موہوم خطرے سے ہر وقت ڈرتا رہتا ہے۔ روپے کی محبت ہمیں دوسروں پر شک کرنا سکھاتی ہے۔ ہم اپنے آپ پر بھی یقین نہیں کرتے۔ وہی شے جسے ہم حد سے زیادہ چاہتے ہیں۔ وہ ہمارے لیے آفتِ جان اور ایک عذاب من جاتی ہے۔ ہمارے اوپر ایک مسلسل دکھ

وارد ہونے لگتا ہے۔ اخلاقی طور پر ہم مجبور ہوتے ہیں۔ مگر اس کا اثر بالآخر اپنے جسم پر بھی ہونے لگتا ہے۔

روپیہ جمع کرنا بذاتہٖ بُرا جذبہ نہیں ہے۔ کون نہیں چاہتا کہ وہ دنیا میں باعزت زندگی بسر کرے۔ مگر جب ہم میں یہ جذبہ انتہا کی طرف جاتا ہے تو وہی بات جو اچھی تھی بُری ہو جاتی ہے۔ دوسروں کو بڑا دیکھ کر جب حسد کی آگ سلگنے لگتی ہے تو یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

اب ذرا اسی جذبے کا ایک اور پہلو لیجئے۔ وہ ہے فضول خرچی۔ فضول خرچ آدمی ہمیشہ تنگ حال رہتا ہے۔ اس کی تنگی اس کی راہ میں ایک روک بن جاتی ہے۔ اس کی فضول خرچی کی عادت اسے ہمیشہ بدحال رکھے گی۔ ایسے شخص کی مثال یوں دی جا سکتی ہے۔ کہ وہ ایک ایسا کسان ہے۔ جو اپنے فصل سے کچے خوشے اُتار کر انھیں کھانے لگتا ہے۔ اور جب دوسروں کے فصل پک کر تیار ہوتے ہیں تو اس کے کھیت میں خشک تنکوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

اس فضول خرچی کی تہ میں بھی سخاوت کا ایک عمدہ جذبہ تھا مگر وہی جذبہ افراط کی نذر ہو کر فضول خرچی میں متشکل ہو گیا۔

متذکرہ بالا مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ سخاوت ایسا قابلِ قدر جذبہ افراط کی وجہ سے فضول خرچی میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ اور کنجوسی جیسا قابلِ نفرت جذبہ ذرا سی احتیاط اور

کردار کی مضبوطی کے باعث کفایت شعاری میں بدل سکتا ہے
جذبات کو تبدیل کرنے والا مادہ معاشرتی ماحول ہوتا ہے۔ جس میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ ماحول ہم پر اسی وقت اپنا اثر کرے گا۔ جب اس ماحول میں سکون ہو۔ کیونکہ سکون کے بغیر ہم کسی سنجیدہ فیصلے پر نہیں پہنچ سکتے۔

جب ہم جوش میں ہوں تو اس وقت ہم اپنے خیالات کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔ کیونکہ اس حالت میں ہم اچھی طرح سوچ نہیں سکتے۔ ہمارے خیالات میں یکسوئی نہیں رہتی۔ بلکہ جوش ہمارے اندر ایک پریشانی سی پیدا کر دیتا ہے۔ یہی پریشانی زیادہ ہو کر حماقت بن جاتی ہے۔ حماقت کے ذریعہ کسی بات کا کرنا نتائج بھی ایسے ہی پیدا کرے گا۔

جب ایک بات عادت بن جائے تو وہ عادت جذبے سے مل کر اچھے نتائج نہیں پیدا کر سکتی۔ کیونکہ عادت کے ماتحت سوچنا اور بات ہے اور ٹھنڈے دل سے کسی بات پر غور کر کے اسے عمل میں لانا اور چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ایک خیال جسے ہم بڑی شدومد سے اپنانا چاہتے ہیں۔ وہ فوراً ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اگر اس پر ذرا غور و فکر کیا جاتا تو اس کے نتائج زیادہ امید افزا ہوتے۔

تلوّن مزاجی کا بھی یہی حال ہے۔ آپ کے سامنے ایک مسئلہ آتا ہے۔ آپ جوش میں آکر فوراً ایک فیصلہ دے دیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اگر اس کی راہ میں ذراسی رکاوٹ

بھی پیش آئی تو آپ بد دل ہو کر بیٹھ جائیں گے۔ اگر حالات نے آپ کو مجبور بھی کیا۔ کہ آپ اس کام کو کرتے رہیں تو اس کا انجام معلوم۔ جہاں کام خراب ہوگا۔ وہاں آپ کی ذات بھی بدنام ہوگی۔ وہ ہمت جو اس کام کو کرسکتی تھی وہ تو آپ کی تلون مزاجی اور حماقت کے ہاتھوں ضایع ہوگئی ہے۔

یہی وجہ ہے۔ کہ متلون مزاج شخص ہمیشہ اپنے افعال بدلتا رہتا ہے جب وہ ایک کام سے بددل ہو جاتا ہے تو فوراً دوسرے کام میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ کاموں کا بار بار تبدیل کرنا دراصل اس مرض کا باعث ہے جس نے تلون مزاجی پیدا کی ایسا شخص اکثر ناکام زندگی بسر کرتا ہے اگر وہ کامیاب ہو بھی جائے تو یہ کامیابی ادھوری ہوتی ہے۔

اب ذرا تصویر کا روشن پہلو لیجئے وہ لوگ جو ٹھنڈے دل سے ہر بات پر غور کرتے ہیں ان کی ساری توجہ ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یہی یکسوئی ان کے عمل میں قوت پیدا کرتی ہے۔ جب ہم سکون سے سوچتے ہیں۔ تو ہمارے ذہن سے باقی سب خیالات گویا نکل جاتے ہیں اور ذہن کے اندر صرف ایک ہی خیال ہوتا ہے۔ کہ ہم کس طرح اس خاص کام میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ جہاں مفید ہوتا ہے وہاں منفعت بخش بھی ہوتا ہے۔

قوت حاصل کرنے کی یہی کلید ہے

پریشاں خیالی، تیز طبیعت اور حماقت ہماری قوت عمل کو

پراگندہ کر دیتی ہے۔ مگر سکون اور ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کرنا ہمارے اندر ایک قوت اور کردار پیدا کرتا ہے۔ ذہن ایک خاص توجہ سے سوچتا ہے۔ اور اپنے منتہا تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

سکون کے بغیر قوت کردار ناممکن چیز ہے۔ جب ہمارے دل میں مختلف جذبات کی لہریں ٹکرا رہی ہوتی ہیں تو سکون کا مضبوط ہاتھ ان کو شانت کرنے کے لیے بڑھتا ہے۔ وہ طاقت جو ان جذبات کو باہمدگر کشمکش کی طرف لے جا رہی تھی۔ سکون کے ذریعے اس خاص نقطہ کی طرف جانے لگتی ہے۔ جس کے بارے میں سوچ بچار محو کار ہوتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ہماری ساری قوت فکر یکسوئی کے ساتھ سوچنے لگتی ہے۔

ذہن کی آزادی صرف سکون کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے ذریعے ہی اعمال میں یک جہتی پیدا ہوتی ہے۔ یکجہتی سے قوت عمل بڑھتی ہے۔ اور اعمال کی تکمیل ہوتی ہے۔

شاید اس سے کوئی یہ نتیجہ نکالے کہ سکون جذبات کا دشمن ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کا کام جذبات میں نظم پیدا کرنا ہے۔ وہ تمام خیالات جذبات اور ہیجانات جو فکر اور سوچ کی راہ میں رکاوٹ بننے والے ہوتے ہیں۔ سکون ان کو ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تاثرات کے ہجوم کے بادلوں کو جو دماغ پر چھا رہے ہوتے ہیں۔ دور کر کے ذہن کی منزل کی طرف رہنمائی کرے۔

دانا وہ ہے۔ جو کام کرنے سے پہلے سوچے۔ ذرا سی بات سے بھی سبق سیکھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب چھوٹا کتا بڑے کتے پر بھونکتا ہے۔ یا اسے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ تو بڑا کتا پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ مگر جب وہ جواب دینے پر آتا ہے۔ تو وہ سخت ہوتا ہے۔ یہ گو روز مرہ کا ایک معمولی واقعہ ہے۔ مگر اس سے ہمیں زندگی کا ایک اہم ترین سبق ملتا ہے۔ طاقتور اپنے سے کمزور پر اپنی قوت ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اس سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ اور کمزور کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنی طاقت ناکام حملوں میں ضائع کرتا رہے۔ طاقتور انسان کی ساری توجہ اپنے نصب العین پر مرکوز ہوتی ہے۔

سکون کو اگر قوت کا باجگذار علاقہ کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ وہ لوگ جنھیں اپنی قوت کا احساس ہے۔ اور وہ اس کا صحیح مصرف جانتے ہیں۔ وہ دوسروں کو اپنی قوت جتانے کی بجائے اسے اپنے اعمال سے صحیح نتائج حاصل کرنے پر صرف کرتے ہیں۔ ہمارے کردار میں اس وقت تک قوت نہیں آسکتی جب تک ہمارے اندر سکون پیدا نہیں ہوتا۔ سکون کے بغیر آپ کے فیصلے جلد بازی کا شکار ہوں گے۔

عربی کی مثل مشہور ہے کہ ایک کند ذہن آدمی کے گھر کو آگ لگ گئی۔ اس نے آگ تو کیا بجھائی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے اپنی حماقت سے اس آگ کو اور پھیلا دیا اور ہمسایہ کی دکان بھی نذر آتش ہو گئی۔

کسی دانا آدمی کو آگ کا احتمال بھی ہوتا تو وہ فوراً قبل از وقت اس کا تدارک کرتا اگر پھر بھی آگ لگ جاتی تو وہ ٹھنڈے دل سے اسے بجھانے کی ترکیب سوچتا۔ دوسروں کو مدد کیلئے بلاتا۔ بجائے اس کے کہ وہ واویلا کرتا اور سراسیمگی کے عالم میں دوسرے کے لئے خطرے کا باعث بنتا۔ اس نے وہ کام کیا کہ اس سے اس کا نقصان بھی کم ہوا لوگ بھی آ گئے۔ اور ہمسائے کا مکان بھی بچ رہا۔ اس کے سکون نے اسے لوگوں میں بھی معزز کر دیا۔

یہی حال ہماری زندگی کا ہے۔ ہماری ذرا سی سراسیمگی سے دوسروں کو نقصان کا اندیشہ رہتا ہے۔ اگر ہم ہر بات پہ ذرا غور کر لیں جذبات کی رو میں بہنے کی بجائے ہم ان جذبات پر قابو پا کر اپنا طریق کار سوچیں۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم کامیاب ہوں گے ہمارا کردار مضبوط ہوگا۔ ہم زندگی کی دوڑ میں ایک مستحکم قدم آگے بڑھا سکیں گے۔

سکون قوت کا نشان ہے اور فتح کی نوید۔ جو اس کے ساتھ آگے بڑھا وہ زندگی میں ہمیشہ بامراد رہا۔ زندگی کی سب سے بڑی کامیابی جذبات پر قابو ہے۔ ورنہ جذبات کی رَو اتنی تیز ہوتی ہے کہ بڑے بڑے طاقتور انسانوں کو اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے

سکون کا پیدا کرنا طبائع پر بھی منحصر ہے۔ بعض طبیعتیں ایسی ہیں جو آسانی سے اپنے جذبات پر قابو پا سکتی ہیں۔ مگر

بعض کے لیے ایسا کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بے حسی اور سکون دو متضاد چیزیں ہیں بے حسی زندگی نہیں موت ہے۔ مگر سکون زندگی کی طاقتوں پر قابو پانے کا نام ہے۔ اسے زندگی کا جوہر کہئے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ یہ خود اختیاری ہے۔

سکون کے بغیر کردار کی قوت ظاہر ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ ہمارا دماغ جب کوئی جلد بازی کا فیصلہ کرنے لگتا ہے تو سکون فوراً اسے ٹوک دیتا ہے یہ ٹوکنا روک نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعے قوت عمل میں دوگنی طاقت آجاتی ہے۔ اس لیے سکون کی جو بھی حالت ہو اس کو حاصل کرنے کیلئے آپ کو قوت ارادی اور معاملہ فہمی کی مشق کرنی ہوگی۔

ہم نے ابھی بے حسی کا ذکر کیا ہے۔ بے حسی ایک قسم کی غفلت شعاری کا نام ہے۔ ہم اس کے لیے کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ اس کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ بے حس انسان کے جذبات کا اظہار نہیں ہوتا۔ ان کے دکھ اور ان کی مسرتیں بہت کم نمایاں ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ اکثر سادہ اور سست ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کے دکھ کی شدت اتنی ہی محسوس ہوتی ہے جتنی ایک حساس شخص کو۔ مگر چونکہ انھیں تگ و دو سے نفرت ہے اس لیے وہ ان دکھوں سے خلاصی پانے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ ان کے لیے ان تکالیف کا برداشت کرنا زیادہ

آسان ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ان کے دور کرنے کیلیے
ٹال مٹول لیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ساری زندگی قوتِ کردار
سے خالی رہتی ہے۔ وہ عمر بھر حالات کے ہاتھ میں ایک کھلونا
بن کر کھیلتے ہیں۔ ان میں اتنی قوتِ ارادی کہاں کہ وہ حالات
کا مقابلہ کر سکیں۔

سکون اور بے حسی میں بعد المشرقین ہے۔ ایک کا نتیجہ آرام
اور سکھ ہے مگر دوسرے کا کام مایوس کرنا ہے۔

سکون کے ذریعے فکر زندگی کے اہم ترین فیصلے کرتا ہے
اور اسی کے ذریعے قوتِ کردار کی نشو و نما ہوتی ہے۔ جس کا
اثر ہمارے ہر ایک فعل پر نمایاں ہونے لگتا ہے۔

"انسانیت کی تاریخ میں اپنے آپ کو پہچانو" کا مقولہ سونے
کے حروف سے لکھا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہم اتنا اور اضافہ کرنا
چاہتے ہیں" اور اس کے ساتھ دماغ میں سکون پیدا کرنے کی کوشش
کرو۔ جس کے ذریعے تم علم سے نفع حاصل کر سکو گے۔"

دُکھ

ہم میں سے کتنے ہی ہوں گے۔ جنھیں بیماری سے وہم کا روگ ہو گا۔ ایسے لوگ سب کے سب عصبی مریض نہیں ہوتے۔ بلکہ ان میں بعض تو نہایت تندرست اور صحیح الدماغ لوگ ہوتے ہیں۔ مگر بات اتنی ہوتی ہے کہ جونہی انھیں کسی مرض کا شبہہ ہوا تو ان کا تخیل بے لگام ہو کر بیماری کی انتہائی صورتیں سوچنے لگا اب سوچ کی یہ بے راہ روی کا اثر دماغ تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ اس حصہ تک جا پہنچتا ہے۔ جو دکھی ہوتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ درد اور تکلیف کی شدت بڑھ جائے گی۔
نفسیاتی تجربات نے ہمیں بتایا ہے کہ کردار جس قدر

مضبوط ہوگا اسی قدر ہم زیادہ خوش رہیں گے۔ کیونکہ رنج کی گھڑی اگر خوشی سے گذار لی جائے۔ تو اس سے رنج کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ دماغ اور کردار کا آپس میں بہت زیادہ تعلق ہے۔ اگر کردار کمزور ہوا تو دکھ کا احساس زیادہ ہوگا۔ اگر مضبوط ہوا تو بڑے سے بڑا دکھ بھی ہنسی خوشی میں برداشت کر لیا جا سکتا ہے۔

ایک بار ایک طبیب کے پاس ایک عورت آئی اس نے بیسیوں مرض گنوا دیے۔ ڈاکٹر نے بڑے اطمینان سے اسے دیکھا اور کہا "محترمہ! آپ کے لیے صرف ایک علاج ہے۔ آپ ان مرضوں کا خیال چھوڑ دیں۔"

یہ بات بالکل درست ہے۔ کہ مرض کا ہر وقت کا دھیان مرض کو بڑھا دیتا ہے۔ کیونکہ جسمانی اور ذہنی اعمال کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے ہمارے سامنے بے شمار مثالیں ہیں۔ مگر یہاں ہم ان سے قطع نظر وہی مثال لیں گے۔ جو زیادہ صاف اور واضح ہو۔ ہم نے یہ مثال اس لیے لی ہے کہ اس میں مریض بالکل تندرست تھا۔ اسے دکھ ضرور تھا۔ مگر اس کا یہ روگ نہ ہی تخیل کی وجہ سے شدید ہوا اور نہ ہی خوف نے اسے زیادہ کیا۔ اس مریض پر وہ نسخہ بھی کارگر ثابت نہیں ہو سکتا، جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ کئی لوگ کسی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں مگر جونہی وہ کسی دوسرے اہم کام میں لگ جائیں اور اس میں انہماک پیدا کر لیں تو ایسے دکھ کی

شدت محسوس نہیں ہوتی۔

ایک شخص پٹھوں کے درد میں بری طرح مبتلا تھا۔ بیچارہ ایک اندھیرے کمرے میں پڑا کرب و بلا میں دن کاٹ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا کہ ہر لمحہ اس کی تکلیف میں زیادتی کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے کسی قسم کی حرکت کرنی چھوڑ دی۔ وہ چت لیٹا رہتا۔ ایک دن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اس کا خادم سراسیمگی کے عالم میں ہانپتا کانپتا اس کے کمرے کے اندر داخل ہوا اس نے مریض کو بتایا کہ اس کا اکلوتا بچہ گر گیا تھا اور اس کا ایک بازو بُری طرح ٹوٹا ہے۔

مریض کے اندر نجانے کہاں سے طاقت آگئی وہ فوراً اٹھا۔ باہر آیا۔ بچے کو دیکھا اور پھر فوراً ڈاکٹر کو بلانے کے لیے فون کیا۔ خادموں کو ضروری ہدایات دیں۔ جب اس کی ہدایات کی تکمیل ہوگئی۔ ڈاکٹر نے بچے کا بازو اچھی طرح باندھ دیا اور بچہ حفاظت سے سلا دیا گیا تو پھر باپ کو اپنا خیال آیا۔ کتنا عرصہ اس میں گذر چکا تھا اسے اپنے درد کا ہلکا سا بھی احساس نہ ہوا۔

جب وہ سارے کاموں سے فارغ ہوگیا تو اس کا دماغ اپنے متعلق سوچنے لگا۔ اسے خود حیرانی تھی کہ ایسا کیوں ہوا۔ اس کا درد کہاں گیا تھا اور پھر درد کہاں سے آنے لگا یہ تجربہ اس کے لیے مشعل راہ بنا۔ اس نے اپنے تئیں دوسرے اہم کاموں میں مصروف رکھنے کی کوشش کی اور وہ کامیاب ہوا۔

اس کا رد گی گھٹنے لگا۔ بعض اوقات تو اسے بالکل آرام معلوم ہوتا۔

اگر ہم اپنی روزمرہ کی زندگی کو بغور دیکھیں تو ہیں اکثر ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات ملیں گے جن سے مندرجہ بالا واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس لیے اس نتیجہ کے ذریعہ ہم زندگی کے دکھوں کا علاج خود تجویز کر سکتے ہیں۔ عقل مندی اور دانائی کا تقاضا یہی ہے۔ کہ ہم جب رد گی ہوں تو فوراً اپنی توجہ کو کسی دوسرے اہم کام کی طرف مبذول کرلیں۔ جب ہمارا دماغ دوسری طرف معروف ہو گیا تو جسمانی تکلیف کم ہو جائے گی اور یہ قوتِ کردار کی فتح ہوگی۔

تاریخ کا مطالعہ بھی ہمارے مذکورہ بالا بیان کی تائید کرے گا ایسے ہزاروں واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی دکھ فوراً کم ہو گیا جب دماغ کا رخ کسی دوسری طرف پھیرا گیا۔ ایک مشہور طبیب جب موت کا شکار ہونے لگا تو اس کا دکھ ناقابل برداشت تھا۔ وہ اپنے گرد جمع ہونے والوں کو دکھ کے متعلق سمجھانے لگا۔ وہ متواتر گھنٹوں بولتا رہتا۔ اس نے علم کے وہ موتی بکھیرے کہ رہتی دنیا تک وہ باقی رہیں گے۔ اس سے اس کے دکھ کی شدّت کم ہوتی گئی۔ اس کا ذہن دکھ کے فلسفہ کی گہرائیوں میں کھو کر جواہر پارے تلاش کرنے لگا۔

ہم شہیدوں کی زندگیاں پڑھکر متاثر ہوتے ہیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوے جان دی۔ آخری وقت جب موت ان کے سروں پر منڈلا رہی تھی تو ان کا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا۔ موت کا

خوفناک دیو اُن کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ جب ان میں سے کوئی موت کے منہ سے بچ نکلا تو پھر ہمیں معلوم ہوا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اس کا ذہن قوم و وطن کے مستقبل کے حسین خواب دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے مخالف کی بربادیاں تھیں جو اس کی موت سے بڑھ کر خوفناک تھیں اپنے مقاصد کی کامیابی کا نظارہ دیکھ کر وہ اپنی جسمانی تکلیف کو بھول گئے تھے۔

ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ لوگ مختلف تحریکوں کیلئے قربانیاں کرتے ہیں۔ وہ اپنی خوشحالی اور آسائش کو قربان کر کے دکھ اور درد کو اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔ جیل خانوں کی کال کوٹھریاں۔ کم اور بری خوراک زمین اور کھردری سطح پر سونا۔ گرمی اور سردی کی مصیبت اور نجانے کیا کیا دکھ ہیں جو ان کی راہ میں آتے ہیں۔ مگر وہ یہ سب کچھ ہنستے کھیلتے برداشت کرتے ہیں۔ ہر مصیبت ان کے لیے ایک راحت بن جاتی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان کا ذہن مصیبت اور دکھ کو محسوس کرنے کی بجائے آنے والے خوشگوار واقعات کو سوچتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس کی قربانی رنگ لائے گی مستقبل میں جب ان کی تحریک کامیاب ہو گی۔ تو پھر اسکے سامنے یہ دکھ اور روگ کیا حیثیت رکھیں گے۔ حال کا دُکھ مستقبل کی ترقی میں مدغم ہو جائے گا۔

ہمارے لیے بھی توجہ کی تبدیلی بڑی مدد ہو سکتی ہے۔ ہم جسمانی درد سے نجات پا سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری

زندگی کامیابی کے مراحل طے کرتی جائے گی۔ آپ نے خود بھی کئی بار کہا ہوگا "اگر فلاں کام نہ ہوتا تو میں شاید اٹھنے کا نام بھی نہ لیتا۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا" کام اور درد سر کا مقابلہ تھا کام کی اہمیت نے جسمانی درد کو بھلا دیا۔ درد موجود ہے۔ مگر اس کا اثر دماغ پر نہیں رہا۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ بعض حالات میں درد کا اثر دماغ سے زائل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی مثالیں ہم بیان کر آئے ہیں کردار میں دکھ سکھ کے اس فلسفہ کو پیدا کرنے کے لیے ہم ذرا اس کی تشریح کرتے ہیں۔

پہلی مثال کو لیجیے۔ مریض شدتِ درد سے اندھیری کوٹھری میں بند پڑا تھا۔ اس کے لیے حرکت کرنا بھی مشکل تھا ذرا سی حرکت اس کے جسم میں گویا درد کی لہریں پیدا کرتی تھی۔ مگر بچے کی تکلیف — اس کے لختِ جگر کا دکھ۔ اس کے اپنے دکھ سے کہیں زیادہ تھا۔ اس کے دماغ نے اسے بتایا کہ اس کا بچہ اس سے زیادہ اہم ہے۔ چنانچہ جسم درد میں مبتلا تھا مگر ذہن درد سے صاف ہو گیا۔ ذہن سوچ رہا تھا۔ کچھ اور۔ اپنا دکھ نہیں۔ بلکہ بچے کا دکھ جسم کے سارے دکھ بچے کے خیال سے کم تر تھے۔ اس لیے وہ اٹھا درد بدستور رہا۔ مگر ذہن پر اس کا اثر زائل ہو چکا تھا۔ اب وہ کچھ اور سوچنے لگا۔ ڈاکٹر۔ دوائی۔ علاج۔ خادموں سے کام لینا۔ بچے کی صحت، اس کا آرام۔ اور جب یہ سب کچھ ہو گیا تو پھر اُسے خیال آیا۔

یہی حال درد سر کے مریض کا تھا۔ درد سے اس کا سر بدستور پھٹ رہا تھا مگر دوسرا کام اتنا ضروری تھا کہ ذہن پر اس نے قبضہ کر لیا۔

اس موضوع پر زیادہ گہرا جانا اس کتاب کا مقصد نہیں۔ اس لیے ہم نے کوشش کی ہے۔ کہ سادہ الفاظ میں اس نفسیاتی نقطہ کو بیان کریں تاکہ ہماری روز مرہ کی زندگی میں یہ کام آ سکے۔

اس سارے بیان کا لب لباب یہ ہے کہ ہمارے کردار میں ایک قوت ایسی بھی ہے۔ جس کے ذریعے ہم دکھ کے احساس کو کم کر سکتے ہیں۔ اس سے اچھے نتائج پیدا کر سکتے ہیں دکھ کو سکھ میں بدل سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے بیماری یا روگ دب جائے گا۔ بلکہ مہلک حالات کے ماسوائے ہم درد اور دکھ کو برداشت کرتے ہوئے اسے تھوڑے عرصے کے لیے بھول سکتے ہیں اور اس عرصے میں ہم مفید کام کر سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں اداکاروں کی زندگی قابل تقلید ہے۔ وہ اسٹیج پر آ کر اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ ان کی ذات اس کردار کی ذات بن جاتی ہے۔ جس کا پارٹ وہ ادا کرنے کے لئے سامنے آئے تھے۔ ان کی اداکاری کا کمال یہی ہے کہ وہ اصل کے مطابق ان کی نقل حقیقت بن کر سارے ہال کو مسحور کر لیتی ہے۔ حالانکہ بہت ممکن ہے کہ اسٹیج پر آنے سے قبل وہ کسی سخت تکلیف میں مبتلا ہوں

یہ واقعہ ہے کہ کئی بار ایک اداکار اسٹیج پر جانے سے قبل بڑی تکلیف میں تھا۔ اس کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔ مگر اسکے بغیر

سارا کھیل چوپٹ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس حالت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ سارا ہال کھچا کھچ بھرا ہے۔ لوگ توقعات لے کر آئے ہیں مگر وہ اداکار جس پر سارا انحصار تھا' بیمار ہو گیا ہے۔ اس کا جسم درد سے دکھ رہا ہے۔ وہ مجبور ہے حیران ہے۔ اچانک گھنٹی بجی۔ گھنٹی کی آواز نے جادو کا اثر کیا۔ اداکار اٹھا۔ بڑھا اور چند لمحوں کے بعد وہ اسٹیج پر تھا۔ پردہ اٹھا۔ اداکار اب روگی نہ رہا۔ بلکہ وہ محض ایک اداکار تھا اور اس نے اداکاری کا خوب حق ادا کیا۔ مگر جونہی پردہ گرا اداکار پھر درد میں مبتلا ہو گیا۔

شاید کوئی یہ کہے کہ قوت کردار کے یہ طریق عارضی ہیں۔۔ ان سے صحت مندانہ اثرات پیدا نہیں ہو سکتے۔ ایسا نہیں۔ بلکہ اس کے ذریعے ہم تکلیف کو کسی اہم ترین خیال سے بدل سکتے ہیں نتائج بعض حالات میں منفی ہیں۔ مگر جب باقاعدہ طور پر دکھ کی جگہ کسی دوسرے خیال کو دے دی جائے تو نتائج یقیناً امید افزا ہوں گے

ان کے نتائج کو بہتر بنانے کے لیے مطالعہ بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے ہم دکھ درد کے ہوتے ہوئے بھی تحقیقات کر سکتے ہیں۔ دکھ کی جس قدر شدت ہو گی اسی قدر ہمارا دھیان مطالعہ میں زیادہ منہمک ہو گا۔ دماغ دور دور کی سوچیگا

کردار کی مضبوطی کے لیے ہم نے چند سادہ اور آسان طریق بیان کیے ہیں۔ دکھ کو برداشت کرنا اور پھر اس کو اس طریق سے سکھ میں بدلنا کہ اس سے اچھے نتائج رونما ہوں۔ یہی

کامیابی کا راز ہے۔ وہ لوگ جو دکھ درد کو بھلا کر ایسے کام کرتے ہیں جن سے ان کی ذات کو فائدہ ہو۔ وہ لوگ کردار کے مالک ہیں۔

ایک مریض اگر ایسے مرض میں مبتلا ہے۔ جس کیلیے اپریشن لازمی ہے۔ تو کردار کی قوت کا یہی تقاضا ہے کہ وہ ہمت سے اپریشن کرائے۔ اگر مریض سسک سسک کر مرنے کو اپریشن کے میز پر مرنے پر ترجیح دے۔ تو یہ اس کی بدقسمتی ہے۔ اگر اس کی قوتِ ارادی مضبوط ہے۔ تو یقیناً اس کا اپریشن کامیاب ہوگا۔ بزدل زندگی میں کئی بار مرتا ہے۔

تسلیم و رضا کی عادت قوت کردار کی ایک اہم ترین خصوصیت ہے۔ اس وقت جب ہم اپنی ساری کوششیں بروئے کار لے آئیں۔ جب ہم یہ جان لیں کہ کوئی امر ہماری قوت و طاقت سے باہر ہے اور ہم نے اپنی ساری تگ و دو ختم کر لی ہے تو پھر ایسی حالت میں تسلیم و رضا بہترین چیز ہے۔ مگر قوت کردار کا تقاضا یہی ہوگا کہ وہ آخری دم تک کام کرے۔

تقدیر

ہر ایک انسان اپنی نشو و نما کا خود ذمہ دار ہے۔ وہ اپنی زندگی کی عمارت کا خود معمار ہے۔ اس لیے ہر ایک فرد بشر پر لازم ہے کہ وہ اپنے ان جذبات کی جانچ پڑتال کرے جن کے زیر اثر اس کے اعمال ہیں۔ پھر اسے چاہیئے کہ وہ اپنی قوت کردار پر بھروسہ کر کے ان جذبات کو اس طرح موڑے توڑے کہ اس کی زندگی زیادہ مفید اور زیادہ قابل قدر ہو سکے۔ اپنے آپ کو ترقی دینے اور آگے بڑھانے کا یہی طریق ہے

اس راہ میں آپ کو کئی مشکلات ہونگیں۔ کئی قسم کے

اثرات آپ کا راستہ روکیں گے۔ مگر جب آپ کا کردار مضبوط ہو تو پھر آخر کار اسی کے طریق پر آپ کی زندگی کا رہوار چلیگا۔ وہی ڈگر زیادہ کامیاب ہوگی۔

ہم اپنی گفتگو میں بار بار تقدیر کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تقدیر دراصل اس مجموعی تاثر کا نام ہے جو ہمارا رویہ اپنے ارد گرد کے حالات اور واقعات کے معاملہ میں پیش کرتا ہے۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ تقدیر کا لکھا اَن مٹ اور اٹل ہے۔ جو کچھ ہونا تھا ایک بار لکھ دیا گیا۔ تو اس سے ہماری ساری زندگی کا نقطۂ نگاہ یاسیت کی طرف مائل ہو جائے گا۔ "تقدیر کا لکھا" ایک ایسا زہر ہے جو انسان کی نس نس میں سرایت کرتا جاتا ہے جو لوگ تقدیر کو اٹل مانتے ہیں اور "ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا"۔ کے قائل ہیں۔ اُنکے لیے گویا زندگی کے سارے راستے بند ہیں۔

اگر ہم یقین کرلیں کہ تقدیر کا لکھا بدل نہیں سکتا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ترقی کی ضرورت نہیں۔ ہم تگ و دو کرنا چھوڑ دیں گے پھر بھلا کیا ضرورت ہے کہ ہم سعی کریں حالات کو بہتر بنانے کا خیال کریں؟ وہ دکھ یا سکھ جو قسمت میں لکھا ہے۔ مل جائے گا۔ بھلا کیوں ہم دکھ سے بچنے یا سکھ کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس منطق کا آخری نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ بقا کے لیے جہد ختم ہو جائے گی زندگی ایک ایسی کشتی ہوگی جو سمندر کی لہروں میں تھپیڑے کھا رہی ہے اس کا ملاح ادپر دیکھ کر موت کا

انتظار کر رہا ہے۔

قسمت اور تقدیر ایک بہانہ ہے۔ جسے کمزور انسان اپنے تئیں دھوکا دینے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہ بہانہ دوسروں کے سامنے پیش کرنے کے لیے بھی کام میں لایا جا سکتا ہے۔

اپنی ناکامی اور کم ہمتی کو چھپانے کے لیے یہ اچھا سہارا ہے

ہم میں سے کتنے ہیں جو کسی کام کو کما حقہٗ کرتے ہیں۔ جب بد دلی اور ادھورے طور پر کام کیا جائے تو لازماً وہ کام اچھے نتائج نہ پیدا کر سکے گا۔ اس کا انجام معلوم۔ لیکن اس ناکامی کے بعد ہوتا کیا ہے۔ "بھائی! کرتا کیا۔ میں نے پوری کوشش کی تھی"! یا "بھیا! قسمت بری ہو تو کوئی خاک کر سکے گا" یا "بابا تقدیر سے لڑنا میرے بس کا روگ نہیں۔۔ پتھر کی لکیر کون مٹائے"!

یہ سب بہانے ہیں۔ تقدیر سے لڑا جا سکتا ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو تقدیر سے لڑتے ہیں۔ اور وہ تقدیر پر فتح حاصل کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں۔ بلکہ ان کی نگاہ سے دوسروں کی تقدیریں بھی بدل جاتی ہیں۔

جو لوگ اپنے ماحول کی ناسازگاری اور فلک پیر کی ستم ظریفی کا شکوہ کرتے ہیں وہ درحقیقت ان اوہام سے خائف ہوتے ہیں۔ جن کا خوف خود ان کی کمزور طبیعت انھیں دلاتی رہتی ہے ان کی زندگی کی باگ ڈور ان کی جبلتوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جن کی بے راہ روی انھیں گمراہ کرتی رہتی ہے۔ اگر وہ سوچ اور سمجھ سے کام لیتے اور اپنی جبلتوں کو اس کے ذریعے عمل میں آتے

تو نتیجہ بالکل اور ہوتا۔ وہ خوف جن سے ان کی زندگی ناکامیوں کا نام تھی۔ دھوئیں کی طرح اڑتا دکھائی دیتا۔

ایک شخص قسمت پر بھروسہ کرکے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے اور اس دن کا انتظار کرنے لگے جب قسمت اسے لکھ پتی بنا دے گی۔ تو اس سے زیادہ اور کون بے وقوف ہوگا۔ قسمت ایسے بدبخت انسان کی طرف نگاہ تک نہیں اٹھاتی۔ ان پر پھٹکار بھیجتی ہے۔ وہ تو ہمیشہ ان کے سروں پر اپنا سایہ ڈالتی ہے۔ جو زندگی کی کشمکش میں مردانہ وار مصروف عمل ہوتے ہیں۔ وہ ان کے لیے مواقع پیدا کرتی ہے۔ کامیابی کا راستہ صاف کرتی ہے۔ اور جب وہ کامیاب ہو جائیں تو ان پر اپنے سارے خزانے نچھاور کرتی ہے۔

کہتے ہیں کہ تقدیر اندھی اور بہری ہے۔ اسے نہ ہم دکھا سکتے ہیں نہ اپنی آواز سنا سکتے ہیں۔ وہ ظالم ہے۔ ناانصاف ہے۔ اس کی دستک ہمیشہ غلط دروازہ پر ہوتی ہے۔ مگر کیا کبھی ہمارے دروازے پر اس کی دستک نہ ہوگی۔ کیا ہم تقدیر کو اپنی طرف نہ لا سکیں گے؟ اس کا جواب ہاں میں ہے۔ کیونکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو بہتیرے لوگوں کی مفروضہ ناکامیاں عقلمندوں کے لیے کامیابیاں ہوں گی۔ ناکامی اور کامیابی سمجھنے والے پر منحصر ہوتی ہیں۔ بیوقوف جس بات پر واویلا کرتا ہے۔ دانا آدمی کے لیے وہی دکھ آنے والے سکھ کا پیش خیمہ ہے۔

ایک قصہ سنیئے:۔

ایک گاڑی بان سفر کر رہا تھا۔ راہ میں گاڑی کا پہیہ ٹوٹ گیا۔ اس نے فوراً گاڑی کو وہیں چھوڑا اور نزدیک کے گاؤں میں پہنچا۔ چوپال پر لوگ بیٹھے تھے۔ اس نے ان سے واقعہ بیان کیا۔ اور نیا پہیہ خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ گاؤں میں بھلا کس کے پاس فالتو پہیہ تھا۔ لوگوں نے اسے آرام کرنے کو کہا۔ وہ مسافر تھا۔ گاؤں والوں نے اس کی خاطر تواضع کی۔

گاڑی بان ادھر مصروف تھا۔ کہ ادھر چوپال پر سے ایک کسان اٹھا۔ وہ گاڑی کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے ٹوٹے ہوئے پہیہ کو دیکھا۔ وہ اسے گھر اٹھالایا اور اس کی مرمت کر دی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ گاڑی بان کے پاس گیا۔ اور اس سے دوسرا پہیہ دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ گاڑی بان خوش ہو گیا۔ اس نے منہ مانگی قیمت ادا کی۔ مگر جب وہ گاڑی کے پاس پہنچا تو پھر معلوم ہوا کہ اس کا اپنا پہیہ ہی مرمت کر کے دوبارہ بیچا گیا تھا۔

ہماری زندگی میں ایسے واقعات عام ہوتے رہتے ہیں بجائے اس کے کہ ہم ذرا سی بات کا فوری تدارک کر دیں۔ ہم اس کی جگہ نئی چیز کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ ذرا سا غیر معمولی واقعہ ہماری ہمت کو پست کر دیتا ہے۔ کوئی حادثہ ہو جائے تو گویا ہم پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ قیامت برپا ہو گئی۔ ہمارا کام بس یہی ہے کہ ہم واویلا کریں شکوہ کریں اور قسمت کو کوسیں۔ تقدیر کا گلہ کریں۔ یہ سب کچھ کریں۔ مگر کام نہ کریں۔ جس سے اس حادثہ کا مداوا ہو سکے۔ ہم نے ابھی کہا تھا کہ ناکامی اور کامیابی اضافی نام ہیں۔

ایک ناکامی سے ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ دوسرا اسے آنے والی کامیابی کا پیش خیمہ سمجھتا ہے۔ اول الذکر بزدل ہے۔ مگر آخر الذکر ایک مضبوط کردار کا مالک ہے۔ اس کے کردار نے اس کے اندر ایک ایسی قوت پیدا کر دی ہے۔ جس کے ذریعہ وہ حادثات اور خلاف توقع واقعات کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کرتا ہے۔ بزدل جسے اٹل تقدیر کہتا ہے۔ صاحب کردار اسے مستقبل کا نام دیتا ہے۔ ایک رات کی تاریکی سے خوف زدہ ہو کر چھپا بیٹھا ہے۔ دوسرا سہانی صبح کے انتظار میں ہے۔ رات دونوں کی کٹ جاتی ہے۔ مگر فرق کتنا ہے۔

ہم ہنسیں یا روئیں وقت کا دھارا بہتا ہی چلا جا رہا ہے۔ وہ لوگ جو اپنے دکھوں پر ہنس دیتے ہیں۔ وہ کتنے باکمال لوگ ہیں بھلا ایسے لوگوں کو تقدیر کا کیا ڈر۔ وہ اندھی ہے یا بہری ظالم ہے یا ناانصاف۔ انھیں کیا۔ ان کا ایک قہقہہ تقدیر کے سارے ہتھیاروں کو بے کار کر دیتا ہے۔

زندگی کا معراج خوشی ہے۔ خوشی کے سامنے دنیا کی ساری نعمتیں ہیچ ہیں۔ اس کو حاصل کرنا مشکل کام ہے۔ اس کے لیے ایک خاص زاویہ نگاہ پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ ہم اس کے ذریعہ زندگی کو دیکھیں۔ اسے دیکھنے کے لیے کردار کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر خوشی کی دیوی کا پانا امر محال ہے۔ کیونکہ ایکبار ایک حسینہ گلاب کی پنکھڑیوں سے زخمی ہو گئی تھی۔ دنیا کی ساری خوشیاں اس کے قدموں پر نچھاور کر دی گئیں۔ مگر پھر بھی وہ دکھی تھی۔ اس نے دکھ کو تلاش کیا اور اس کی سیج پر پھولوں کی

تیاں اسے دکھ دینے لگیں۔

خوشی کا انحصار بیرونی کامیابیوں پر مسرور ہونے میں نہیں ہے بلکہ حقیقی خوشی ہمارے اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ ہمیں احاطہ کر لیتی ہے۔ قدرت کی نعمتوں کو سمجھنے اور جاننے سے خوشی اور مسرت ملتی ہے۔ ذرا سورج کو غروب ہوتے دیکھیے اس وقت شفق پھول رہی ہوتی ہے۔ اس کی سرخی مغرب میں ایک آگ لگا دیتی ہے۔ یہ آگ کتنی حسین، کتنی پیاری ہوتی ہے حسن خوشی کا دوسرا نام ہے۔ صبح کا سہانا وقت ہے۔ آپ نے آنکھ کھولی ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اس کے ساتھ گوالے کی بنسری کی مدھ بھری ایک تان آپ کے کانوں نے سنی آپ کی روح مسرت سے ناچ اٹھی یہ خوشی ہے۔ اس کے سامنے زر و جواہر کے وہ ڈھیر خاک نہیں جن کی موجودگی اس کے مالک کو ایک پل کے لیے بھی چین نہیں لینے دیتی۔ یہ خوشی آپ کو اپنے خاندان میں، جگری دوستوں میں ملے گی۔ اس کے سامنے دولت ہیچ ہے۔ کتنا بدبخت ہے وہ انسان جو اپنے عزیزوں اور دوستوں کی قربانی دے کر دولت کو خریدتا ہے۔ اور کتنا بے وقوف ہے وہ شخص جو اس شخص کو صاحب قسمت سمجھتا ہے۔

آیئے ذرا خوشی کی اور تلاش کریں۔

وہ لوگ جنھیں ہم حقیقی معنوں میں بڑے آدمی سمجھتے ہیں ان کے نزدیک خوشی ان ذاتی اقتدار میں پوشیدہ ہوتی ہے جو وہ قائم کرتے ہیں۔ جوں جوں انھیں اپنی ذات کی تکمیل کا احساس

ہوتا ہے وہ زیادہ مسرت محسوس کرتے ہیں۔ ایک موجد جب برسوں کی لگاتار محنت کے بعد کامیابی کی راہ دیکھنے لگتا ہے۔ تو اس کے لیے وہی خوشی ہے۔ وہ سب باتیں جنھیں ہم بدقسمتی سے منسوب کرتے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے کمزور انسان کا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ دراصل خوشی کا منبع ہیں۔ کیونکہ جب ہم ان حالات سے نکلنے کے لیے تگ و دو کرتے ہیں۔ اور اس میں ذراسی کامیابی ہوتی ہے تو وہ اپنے ساتھ خوشی لے کر آتی ہے۔ خوشی کا سرور بدقسمتی کی ساری تلخیوں کو بھلا دیتا ہے۔

یہ تو ہم نے محض عادات کا ذکر کیا ہے۔ زندگی بسر کرنے کا یہ طریق تباہیوں پر حاوی ہے۔ بڑی سے بڑی تباہی و بربادی بھی اپنے اندر ایک تعمیر رکھتی ہے۔ کوئٹہ برباد ہوا۔ کیا آج کا کوئٹہ کل کے کوئٹہ سے بہتر نہیں بنا۔ موجودہ جنگ کی تباہ کاریاں کتنی ہولناک ہیں۔ مگر جنگ کے بعد کی دنیا یقیناً آج سے بدرجہا بہتر ہوگی۔

کمزور کردار کے انسان کے لیے تو شاید بم کے گولے کی آواز ہی کافی ہے۔ وہ ہمت ہار کر بیٹھ جائے گا۔ مگر وہ لوگ صحیح معنوں میں صاحب کردار ہیں۔ جو بموں کے اندر اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ بم کی آواز۔ گولے ان کے دل میں خوف پیدا نہیں کرتے۔ بلکہ وہ مردانہ وار اس مصیبت کو ہنستے کھیلتے کاٹ رہے ہیں۔

زندگی مردوں کے لیے ہے۔ جن کا کام آگے بڑھنا ہے

وہ بھلا رو لے دھونے میں کیوں اپنا وقت ضایع کریں گے۔ ان کے سامنے سے مصیبت ٹل جاتی ہے۔ تاریکی اور بدقسمتی ان کو ہراساں نہیں کر سکتی۔ وہ مردانہ وار آگے بڑھتے ہیں اور بڑھتے جاتے ہیں۔

ایسے لوگوں کی راہ میں لاکھ دشواریاں سہی۔ مگر وہ کوشاں ہیں۔ مصائب کے پہاڑ ان کا راستہ روک لیں۔ مگر وہ بڑھنے کی کوشش کریں گے۔ وہ اگر ایک بار ناکام ہوں گے۔ تو نئے حالات پیدا کرنے کی سعی کریں گے۔ وہ زندگی کی ناکامیوں کو بھول جاتے ہیں۔ اگر انھیں کچھ یاد رہتا ہے۔ تو وہ تجربہ ہے۔ جس کے سہارے وہ آیندہ کامیابی کے نزدیک ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک شخص جو مرور زمانہ کی وجہ سے برباد ہوگیا تھا۔ مجھے ملا۔ کہاں اس کی وہ شان کہ موٹر کار کے بغیر ایک قدم نہ چلتا تھا۔ مگر اب وہ مجھے راستے میں پیدل ملا۔ میں نے اظہار افسوس کرنا چاہا۔ مگر وہ مسکرا کر بولا۔

"بھائی! میں نے آج تک کبھی سڑک پر چلنے کا لطف نہ اٹھایا تھا۔ میں نے کبھی دوسرے لوگوں سے مل کر زندگی کی نعمتیں نہ دیکھی تھیں۔ اب مجھے موقع ملا ہے۔ کہ میں زندگی کو ایک نئے زاویے سے دیکھوں۔"

اس شخص کے اس کردار نے اُسے مصیبت میں بھی خوش و خرم رکھا۔ اور چند برس کے بعد وہ پھر اپنی اصلی حالت کے

قریب پہنچ گیا۔

یہ عام لوگوں کا خیال ہے "مسلسل خوشی سے بھی جی تنگ آجاتا ہے"۔ کیونکہ جو شخص آسانی سے مسرت اور شادمانی حاصل کرے اُسے اس میں زیادہ لطف نہیں آتا۔ لیکن وہ لوگ جو تگ و دو کے بعد کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ ان کے لیے ہر کامیابی ایک مسرت کا پیغام ہوتی ہے۔ اس سے وہ تنگ نہیں آتے۔ بلکہ ہر ایک نئی خوشی اُن کے کردار کو اور زیادہ مضبوط کرتی ہے۔

جب یہ لوگ ایک منزل تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر اُن کے سامنے دوسری منزل کا خیال آجاتا ہے۔ وہ آگے بڑھنے کے لیے اور محنت کرتے ہیں۔ پہلی کامیابی ان کے لیے محض ایک قدم کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو ترقی کی راہ میں اٹھایا جائے۔ وہ لوگ جو اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے اہل ہوتے ہیں۔ وہ کبھی تقدیر کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں بنتے۔ یہ جہان ان کے لیے ایک میدان ہے۔ جہاں وہ اپنی پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لاکر زندگی کی دوڑ جیتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تسلیم و رضا ایسے لوگوں کے لیے اور حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ عمل کے بعد نتائج کے لیے تسلیم و رضا کے قائل ہوتے ہیں ان کے لیے یہ ایک منزل کے مترادف ہے۔ جہاں وہ دم لینے کے لیے رکتے ہیں۔ منزل خواہ کتنی کٹھن ہو۔ وہ ہمت نہیں ہارتے بلکہ تازہ دم ہوکر آگے بڑھنے کی تیاری کرتے ہیں۔

"دم لینا" دراصل حالات کی ناسازگاری کا اعتراف ہوتا ہے

نہ ہے بھی بجا — یہی وہ مقام ہے۔ جہاں کردار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس وقت کی سوچ حال کی ناکامی کو شاید نہ بدل سکے۔ مگر اس کے آیندہ نتائج ضرور اچھے ہو سکتے ہیں کیونکہ ہم تازہ دم ہو کر زیادہ سکون سے سوچ سکیں گے۔

بے وقوف آدمی ہی دیوار کو ٹکر مار کر اُسے گرانے کی کوشش کرے گا۔ دانا آدمی دیوار کو دیکھ کر اس سے اندازہ لگائے گا اور اُسے راہ سے ہٹانے کے لیے تجاویز سوچے گا۔

بے وقوف تھک ہار کر تسلیم و رضا کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ مگر دانا تسلیم و رضا کے سائے میں ذرا ستا کر دیوار پھاندنے کی نئی تجویز سوچتا ہے۔

یوں ایک ہی عمل دو انسانوں کے لیے مختلف نتائج پیدا کرتا ہے۔ ایک حالت میں یہ ناکامی کی آخری حد ہے اور دوسری حالت میں ایک نئی دوڑ کے لیے پہلی منزل۔ وہ سوچ جو ہمیں آخری حالت کی طرف راہ نمائی کرتی ہے فلسفہ کہلاتی ہے۔ اس کے ذریعے ہم کردار میں سوچ سمجھ کر عمل کرنے کی عادت پیدا کرتے ہیں۔

کردار کو مضبوط کرنے کے لیے صبر بھی ایک لازمی جزو ہے۔ صبر ایک ایسا جوہر ہے جو خاموشی کے لباس "کردار" کو حسین بنا دیتا ہے۔ اس سے آراستہ ہو کر آپ تقدیر کے اندھے دیوتا کو بھی رام کر سکتے ہیں۔ صبر کے لیے عمل سے زیادہ قوت کی ضرورت ہے۔ عمل کا اثر اعصاب پر ہوتا ہے۔ اعصاب

کام کرتے کرتے جب تھک جائیں تو ذرا سا سستا لینا ساری تھکاوٹ دور کر دیتا ہے۔ مگر صبر کے لیے لوہے کے اعصاب اور پتھر کے دل کی ضرورت ہے۔ اپنے آپ پر پورا قابو ہو۔ بڑے سے بڑے مخالف حالات میں بھی صبر کا دامن نہ چھوٹے اور جب یہ حالت پیدا ہو جائے تو پھر کردار بہت بلند ہو جائیگا۔

صبر کے ساتھ استقلال کا بھی جوڑ میل ہے۔ جب یہ دونوں مل جائیں۔ تو پھر تقدیر کی ساری رکاوٹیں قسمت کی ساری بدنصیبیاں مٹ جاتی ہیں۔ صبر اور استقلال کی رفتار بڑی مدھم ہوتی ہے۔ لیکن جہاں ایک بار قدم رکھا گیا۔ اسے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔

جلد بازی صبر اور استقلال کی ضد ہے۔ یہ کمزور کردار والوں کا ہتھیار ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ فوراً جلد بازی سے حالات کو تبدیل کرلیں۔ مگر اس کا نتیجہ —— شاید کبھی کامیابی ہو جائے۔ ہمیشہ منفی ہوگا

جو لوگ تقدیر کا گلہ کرتے ہیں۔ کبھی ان کا اعتبار نہ کریں۔ تقدیر واقعی ظالم ہے۔ ناانصاف ہے۔ صرف ان لوگوں کے لیے جو کمزور ہیں۔ جو تقدیر کی چوٹ کی تاب نہیں لا سکتے۔ مگر وہ لوگ جو مضبوط کردار والے ہیں۔ تقدیر ان پر مسکراتی ہے۔ جو لوگ اس کی چوٹ کا جواب چوٹ سے دیتے ہیں۔ تقدیر کا اندھا دیوتا اُن کے سامنے جھک جاتا ہے اور پھر کردار اور تقدیر آپس میں صلح کر لیتے ہیں۔ یہ وہی مقام ہے جہاں تقدیریں بدلنے لگتی ہیں۔

کمزور جذبات

کردار کو مضبوط بنانے کی راہ میں محبت بھی ایک روک ہے۔ یہ ایک ایسی روک ہے۔ جس کے سامنے بڑے بڑے ہوش ہتھیار ڈال دیتے ہیں کردار کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو۔ لیکن محبت کے معاملے میں وہ بھی بے بس ہو جاتا ہے۔

مامتا محبت کی مقدس ترین شکل ہے۔ قدرت نے ماں کی اس محبت میں وہ طاقت دی ہے کہ اس سے بچے انسانیت کی معراج حاصل کر سکتا ہے۔ ماں ہی بچے کی صحیح رہنمائی کر سکتی ہے۔ درحقیقت بچوں کی ساری زندگی کا انحصار اسی پیار پر ہے۔ جو ان کے والدین کو ان سے ہوتا ہے۔ اگر یہ

لاڈ پیار کرنے والے مضبوط کردار کے مالک ہیں۔ تو وہ بچے کو اس طرح پیار کریں گے۔ کہ اس کی جبلتیں نشوونما پائیں۔ وہ جب جوان ہو تو اُسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو۔ جس طرح اس سے محبت کی گئی ہے۔ وہ بھی اس طرح محبت کرنا سیکھے۔

اگر والدین کمزور طبیعت کے ہیں۔ تو ان کے لاڈ پیار سے بچہ خراب ہوگا۔ یہ خرابی بچے میں انانیت پیدا کرے گی پھر بچہ والدین کی ساری توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے ضد کریگا۔ اس میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوں گی۔ اس کا کردار بھی کمزور ہوگا۔ زندگی کی دوڑ اس کے لئے دوبھر ہوگی۔ پھر وہ زندگی سے دور کر پناہ لینی چاہے گا۔

محبت کا جذبہ دونوں صورتوں میں کارفرما ہے۔ مگر جب بچہ ضد کرتا ہے۔ تو ایک والدین سمجھ سے کام لے کر بچے کو ذہن نشین کرا لیتے ہیں۔ کہ اس کا ایسا کرنا درست ہے۔ آہستہ آہستہ بچے کا ذہن والدین کی بات کو سمجھنے لگتا ہے۔ مگر دوسرے والدین کا بیجا پیار بچے کو اور خراب کرتا ہے۔

آپ کہیں گے کہ ننھے بچے کو سمجھانا ممکن بھی ہے ؟ ہے اور وہ یوں کہ آپ کے کردار اور افعال سے بچہ متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے آپ محبت کیجئے۔ مگر اس طرح کہ یہ جذبہ آپ میں کمزوری نہ پیدا کر دے۔ آپ اپنے آپ کو تھام کر پیار کیجئے۔ تاکہ بچے کے ننھے دماغ میں اپنے فرض کا احساس پیدا ہوتا رہے

جوں جوں وہ بڑھے گا۔ یہ احساس خود بخود مستحکم ہوتا جائیگا۔

بعض والدین اپنے بچوں کو جدا نہیں کرسکتے۔ ان کے لیے جدائی کا خیال بھی سوہان روح ہوتا ہے۔ حالانکہ بچوں کی زندگی والدین سے دور رہ کر زیادہ اچھی ہوسکتی ہے۔ ان کی تعلیم بہتر ہوگی۔ اس اندھی محبت کا نتیجہ دونوں کے لیے خراب ہوتا ہے۔ والدین میں بچے کے قرب کا احساس اور بچے میں والدین کی توجہ کا احساس۔ بچہ اس کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ بھی دوری کے خیال سے مچلنے لگتا ہے۔

اگر ہم ان لوگوں کے حالات زندگی کریدیں جنھیں ہم دنیا کے مضبوط ترین انسان سمجھتے ہیں۔ تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ لوگ بچپن میں ہی ماں کے گھونسلے سے اڑنے لگے تھے۔ اور ان کے والدین نے بھی بچپن سے ہی زندگی کی ذمہ داریوں کا احساس انھیں دلانا شروع کردیا تھا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ آیا پرندوں کی طرح جوں ہی ان کے پر نکلنے لگیں۔ بچے کو بھی اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے؟ ہرگز نہیں — بلکہ بچے کی سب سے بڑی تعلیم گاہ اُسکا گھر اور اس کا خاندان ہے یہیں سے اس کی فطری ودیعتوں کی نشو ونما ہوتی ہے۔ اسے مل بیٹھنا آتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اتنا خیال رکھا جائے۔ کہ گھر جنت کا نمونہ ہو۔ اور اس کی دلفریبی بچے کو اپنی طرف متوجہ رکھے۔ وہ قید خانہ نہ ہو۔ جہاں بچے کو مجبوراً رکھا جائے۔ جب بچے پر جبر کیا جاتا ہے۔ تو گھر کی ساری

دلچسپیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔

اگر ہم کسی بات کے دباؤ کے ذریعے بچے کو ذہن نشین کرانا چاہیں۔ تو وہ ہرگز اُسے قبول نہ کرے گا۔ مگر جونہی ہم نے پیار سے آہستہ آہستہ بات سمجھائی۔ بچے کو اس کے حالات کے مطابق آزادی دی۔ تو یقیناً بچے میں وہ ساری خوبیاں پیدا ہو جائیں گی۔ جن پر ایک اچھے سماج کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

دوستی کا جذبہ بھی انسانی کردار میں ایک قابل قدر جذبہ ہے۔ دوستی کیا ہے؟ — دو دلوں کا ملاپ اور خیالات کی ہم آہنگی۔ دو انسانوں کا یوں باہم مل جانا۔ع تاکس نہ گوید بعدازیں من دیگرم تو دیگری۔ یہ جذبہ جہاں انسانیت کے کمال کا اظہار کرتا ہے۔ وہاں یہ سب سے کمزور ترین پہلو بھی ہے۔ دوستی کا مطلب محض باہم مل بیٹھنا ہی نہیں۔ یا اس سے صرف اس قدر مراد لی جائے کہ ایک نے احسان کیا۔ دوسرے نے بدلہ چکا دیا۔ بلکہ اس کا کمال تو یہ ہے۔ کہ ہم اپنے دوست کی ہر ممکن امداد کریں۔ قوتِ کردار کے لیے دوستی کے معاملے میں انتہائی قربانی کی جاتی ہے۔

دوستی کے معاملے میں ہمیں معمولی معمولی باتوں سے چشم پوشی کرنا ہوتی ہے۔ اگر ہم انھیں باتوں میں الجھ کر رہ جائیں اور دوست سے ہمیشہ توقعات ہی رکھیں تو یہ ہماری خودغرضی ہوگی۔ اگر ہمارے دوست کا کردار کمزور رہے۔ ہم اس کی ہر بات کو پورا کرتے رہیں تاکہ ہماری دوستی قائم رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا

کہ ہم بھی کمزور ہونے لگیں گے۔

یہ ایک اصولی بات ہے کہ جب دو انسان ایک دوسرے کی دوستی کے رشتے میں منسلک ہو جائیں۔ اور وہ اخلاقی طور پر ایک دوسرے کی مدد کرنے لگیں۔ تو ایک دوسرے کا اثر اُن کے کردار پر بھی ضرور ہو گا۔ وہ شخص جو ذہنی طور پر زیادہ بلند ہو گا۔ وہ دوسرے دوست کو اپنے رنگ میں رنگنے لگے گا۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو پھر دوسرے دوست کا رنگ خود بخود اس پر چڑھ جائے گا۔

دوستی کتنا مقدس جذبہ ہے۔ مگر اس کے غلط استعمال سے ہم اپنا کردار کھو بیٹھتے ہیں۔

دوستی کے بعد محبت آتی ہے۔ محبت دو روحوں کا ملاپ ہے یہ ملاپ اگر اخلاق کی خوبصورتی کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ تو محبت ایک لافانی جذبہ بن جاتا ہے۔ جو محبت کرنے والوں کو انسانیت کی بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ جذبہ خواہشات کی رو میں بہنے لگے۔ تو پھر یہ پاک جذبہ جنسی تعیش بن جاتا ہے۔ اور یہ انسانیت کی اسفل حالت ہو گی۔

اسی سلسلہ میں شادی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ شادی کے بعد کردار کے مضبوط ہونے کے زیادہ مواقع میسر آتے ہیں۔ کیونکہ شادی کے بعد ہم ایک دوسرے کی کمزوریوں کے باوجود زندگی بسر کرنا سیکھتے ہیں۔ ہم میں قوت برداشت پیدا ہوتی ہے اس سے کردار بنتا ہے۔ صبر اور استقلال پیدا ہوتا ہے۔ جن کے

ذریعہ زندگی زیادہ بہتر بسر کی جا سکتی ہے۔

جذبات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم ذرا اور آگے بڑھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں جذبات کی رو میں بہنے سے بچانے والی چیز کردار ہے۔ اس کے ذریعے ہم بہنے سے بچ سکتے ہیں۔ یہ ایک مضبوط چٹان ہے جس پر کھڑے ہونے سے ہمارے پاؤں مضبوط ہو جائیں گے۔ کمزور انسان موقع پڑنے پر فوراً ڈگمگا جاتا ہے۔ وہ جذبات کی شدت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسے معلوم نہیں کہ زندگی کے ارتقا کے لیے جذبات کو کیسے عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ وہ بنیادی جبلتوں اور فروعی جذبات کو جانتا ہی نہیں۔ بلکہ جب کردار مضبوط ہو تو وہ موقع کی نزاکت کے مطابق عمل کرتا ہے۔

جبلت اور سوچ سمجھ کا امتزاج کردار پیدا کرتا ہے۔ اور کردار ان تمام کمزوریوں کو روکتا ہے۔ جو جبلتوں کی تقلید سے پیدا ہوتی ہیں۔ جذبات کے دریا کا کام انسانی اعمال کے کھیتوں کو بہا لے جانا ہے۔ لیکن جب فکر اور تدبر کے بند لگا کر اس دریا کا راستہ معین کر لیا جائے۔ تو پھر اس سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔ وہی لہریں جو بربادیوں کا پیغام لے کر جا رہی تھیں۔ اب ہزاروں بہاریں ساتھ لے کر آتی ہیں۔ ذرا سی فکر نے بربادیوں کو تعمیر میں تبدیل کر دیا۔

اسی طرح ہم بھی جبلت کی اُن لہروں کو جن کا کام تباہی و بربادی ہے۔ تعمیری کام کی طرف لگا سکتے ہیں۔ اس کے ذریعے ہماری زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہو گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم

جذبات اور سوچ سمجھ کو ہمیشہ پہلو بہ پہلو رکھیں۔ جب طبیعت میں ہیجان کا طوفان اٹھے تو اسے تھامنے کے لیے تدبر اور فکر کا بند لگا دیا جائے۔ اس سے ہم دیکھیں گے کہ زندگی کی بہت سی حماقتیں کم ہو جائیں گی۔

کمزور جذبات کی فراوانی کا نتیجہ شک پرستی ہے۔ ایسا شخص جب زندگی کی حقیقتوں سے دو چار ہو کر ناکامیوں کا سامنا کرتا ہے۔ تو اس کی ساری امیدیں بُری طرح ٹوٹتی ہیں۔ اور آخر کار یہ شخص خود اعتمادی بھی کھو بیٹھتا ہے۔ لیکن اسکے بالمقابل جس شخص کا کردار بلند ہو گا۔ اس کے لیے ناکامی آنیوالی کامیابی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ وہ اس سے ہراساں نہیں ہوتا۔ نہ وہ اپنی خود اعتمادی کھو بیٹھتا ہے

خود اعتمادی کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں (ego) "ایغو" یا "انا" کا خیال آتا ہے۔ ہم میں یہ "انا" کئی صورتوں میں موجود ہے اگر یہ صورتیں آپس میں ٹکرا جاتی ہیں۔ اور اُن کے ٹکرانے کے نتائج خطرناک ہوتے ہیں۔ ایسی حالتوں میں بھی وہی طریق مفید ہو گا۔ جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ یعنی ایک خواہش کی جگہ دوسری خواہش کا پیدا کرنا اور ایسا کرتے وقت سمجھ بوجھ کو ہاتھ سے نہ دینا۔

یہ طریق کردار کی بلندی چاہتا ہے۔ تاکہ ہم اپنے اعمال کو منطق اور فکر کے ماتحت کر سکیں۔ وہ لوگ جو زندگی کے نازک موقعوں پر اپنی قوتوں کو بروئے کار نہیں لا سکتے۔ وہ اس پرندے کی مانند ہیں۔ جو قفس کی تیلیوں سے سر پھوڑ لینے کو ہی رہائی کا

ذریعہ جانتا ہے۔

قوت کردار درحقیقت اخلاقی اور مادی آزادی کے سمندروں کی ایک خاکنائے ہے۔ کیونکہ اپنے آپ پر قابو پالینا ہی سب سے بڑی خودمختاری ہے۔ ذہنی قوت کے ذریعے ہمیں نہ صرف اخلاقی آزادی میسر آتی ہے۔ بلکہ یہی شخصی آزادی کا ایک ذریعہ ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کرلی جائے کہ اخلاقی آزادی سے ہی شخصی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اور جب یہ انفرادی حاصل ہو جائے تو اس سے سماجی آزادی کی داغ بیل پڑتی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک مہذب انسان اپنی نوع کے لیے مفید نہ ہو۔ وہ اپنے بھائی بندوں کی بھلائی چاہے گا۔

یہ بھلائی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو وہ جو ہم فطری طور پر کرتے ہیں۔ دوسری وہ بھلائی جسے ہم سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ پہلی بھلائی میں ہماری "انا" موجود ہوگی۔ تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ ہم بھلائی کرسکتے ہیں۔ مگر دوسری حالت میں ہم اسے اپنا اخلاقی فرض جان کر کرتے ہیں۔ پہلی حالت جبلی حالت ہے۔ دوسری کردار کی بلندی۔

نیکی ایسی مقدس شے بھی کردار کی بلندی کے بغیر کمزور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس نیکی میں ہماری سوچ کا دخل نہیں۔ بلکہ ہم اپنی "خودی" کی تسکین کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ اس سے ہماری انانیت کو تسلی ہوتی ہے یا پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی کو تکلیف میں

دیکھ کر ہمیں تکلیف ہوتی ہے۔ ہم اپنی تکلیف کے دور کرنے کے لیے
نیکی کرتے ہیں۔ یہاں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نیکی کی حقیقت میں امتیاز
کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ مگر ایسا ہوتا ضرور ہے۔ کئی بار ہم نے دیکھا
ہے کہ جب اور کوئی شخص دکھ میں ہو اور اس کا اثر ہماری ذات پر
نہ پڑے تو ہم اس کی مدد کے لیے شاذ و نادر ہی جاتے ہیں۔

رحم کا جذبہ بھی ہماری انانیت کا ایک مظاہرہ ہوتا ہے۔
جب ہمیں کسی پر ترس آتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ ہماری
ایغو کو دکھ پہنچا ہے۔ اور اس دکھ کو ہم ترس کا نام دیکر اس کا
اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً آپ نے ایک مفلس کو دیکھا۔ اس کی بُری
حالت دیکھ کر آپ کو دکھ ہوا۔ یہ دکھ درحقیقت ایک خوف سا ہے۔
ہمارا دماغ سوچتا ہے کہ اگر میں ایسا ہوتا تو ـــــ آپ اپنے دکھ کو
یوں دور کرتے ہیں کہ آپ نے اسے چند ٹکے دے دیئے۔ اس
سے اس کی تکلیف دور نہیں ہوئی۔ کم ہو گئی ہو گی۔ لیکن اگر آپ کو
اس پر حقیقی طور پر ترس آتا اور آپ کا کردار بلند ہوتا۔ تو آپ اس جڑ
کو دیکھتے جو خشک ہو گئی ہے۔ اس مرض کو دور کرنے کی سعی کرتے
جو اس شخص کو لاحق ہے۔

جو شخص اپنا کردار بنانا چاہتا ہے۔ وہ ہمیشہ جذبات کی
فراوانی سے دور رہتا ہے۔ شاید آپ پوچھیں کہ کیا قوت کردار
کے لیے جذبات سے عاری اور سنگ دل ہونا ضروری ہے؟
اس کا جواب دینے کے لیے ہم ایک سوال کریں گے۔ کیا وہ لوگ
جو جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ خود غرض نہیں ہوتے؟ اس کا

جواب یقیناً ہاں میں ہو گا۔ جذبات اگر خود غرضی کو نہیں روک سکتے۔
تو بھلا قوت کردار جذبات سے ہو سکتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہاں
جذبات عقل کے تحت ہو کر انسانیت کے ممد ہوتے ہیں۔
انانیت۔ جذبات فطری دو چیزیں ہیں۔ اُن کی افراط اور
تفریط دونوں مضر ہیں۔ افراط آپ کو اپنی لہروں میں بہائے جاتی
ہے۔ تفریط آپ کو انسانوں سے محبت کرنے سے روکتی ہے۔ لیکن
جب انانیت، جذبات سوچ اور سمجھ مل جائیں۔ تو اس کا نتیجہ ایک ایسے
انسان میں ظاہر ہوتا ہے۔ جسے خود خالقِ ارض و سما نے اپنا نائب
کہا ہے۔

خوف

ہماری زندگی میں خوف بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اکثر افعال اس لیے سرزد نہیں ہوتے کہ ہمیں ان کے کرنے سے ڈر لگتا ہے۔ اور بہت سی باتیں ہم اس لیے نہیں کرتے کہ خوف ہماری ہمت توڑ دیتا ہے۔ بہت سے لوگوں کی زندگی محض اس کے لیے ناکام رہتی ہے کہ وہ کوئی نیا قدم اٹھاتے ہوئے خوف محسوس کرتے ہیں

خوف ایک سایہ ہے جو ہمیشہ زندگی پر منڈلاتا رہتا ہے۔ یہ سایہ محض ہمارے تخیل کی ہی ایک شکل ہوتی ہے حالانکہ اس کا وجود عدم کے برابر ہوتا ہے۔ زندگی کی کتنی لذتیں، خوشبوؤں کے

کتنے موقع اور راحتوں کی کتنی گھڑیاں ہیں۔ جو اس سائے کے پڑنے سے رنج والم میں بدل گئیں۔ بزم طرب یاس بن گئی۔

خوف ایک کرب ہے جو خطرے کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ اکثر یہ خطرہ ایک وہم ہوتا ہے۔ اس کے پیدا ہونے سے ہمیں اپنی کم مایگی اور بے بسی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ہماری سلامتی اسی بات میں نظر آتی ہے۔ کہ ہم زندگی کی کشمکش سے کسی گوشۂ عافیت میں پناہ لیں۔ ہمارا یہ طریق کار ہماری مشکلات کو حل نہیں کرتا۔ بلکہ یہ محض کم ہمتی ہے۔ جس کا باعث خوف ہوتا ہے۔

خوف کا منبع اکثر کوئی ایسا لاشعوری خیال ہوتا ہے۔ جسے ہماری عافیت پسندی زیادہ مہیب بنا دیتی ہے۔ حساس انسان ذرا سے خطرے سے بدکنے لگتا ہے۔ اس خیال کو دماغ سے نکالنے کے لیے قوت کردار کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جب خوف چھا رہا ہو۔ تو کوئی شخص سمجھ بوجھ کی بات نہیں سنا کرتا۔

بادل کی گرج کو لیجئے۔ کمزور دل آدمی کو آپ لاکھ سمجھائیں کہ یہ گرج بادلوں کے ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر وہ نہیں مانیگا۔ وہ خوف زدہ ہوکر کسی کونے میں پناہ گزیں ہوگا۔ حالانکہ گرج کے بعد اس کی ساری ہیبت ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ اب بھلا ایسے شخص کو جو گرج کے بعد پہروں کانوں میں انگلیاں ٹھونسے کمرے میں بند رہے۔ آپ کیا سمجھا سکیں گے۔ سائنس کا علم اس کے کس کام آئیگا ایسا شخص تو ایک بچے کی مانند ہے اور بس۔

بعض لوگوں کو اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔ وہ خ

جانتے ہیں کہ اندھیرے سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ مگر اس کے باوجود وہ اندھیرے کمرے میں جاتے ہوئے خوف کھاتے ہیں۔ یہ کمرہ ان کا اپنا کمرہ ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے لیئے تو روشنی کا نہ ہونا ہی ان کے دل میں خطرہ پیدا کر دیتا ہے۔ وہ یوں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ گویا وہ کسی گہرے تاریک غار میں ڈھکیلے جا رہے ہیں۔ جس کے اندر نہ جانے کیا کیا عذاب ہوں گے۔

ایسے لوگوں میں قوت کردار پیدا کرنا ذرا مشکل کام ہے کیونکہ خوف ایک ایسا اٹل پہاڑ ہے۔ جس کا زندگی کی راہ سے ہٹانا ذرا محال سا ہے۔ اس خوف کا باعث سوائے کمزوری کے اور کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ ایسے شخص کو جب ذرا سہارا مل جائے اور ان سے بھی زیادہ کمزور انسان اندھیرے کا ساتھی بن جاتے تو وہ پھر اندھیرے سے نہیں ڈرتے۔ حالانکہ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر واقعی کوئی اندھیرے میں حملہ کرے تو ان کا ساتھی ان کے لیے وبال جان ہو جائے گا۔ خوف اور سوچنا دو متضاد چیزیں ہیں۔ بھلا وہ کیوں سوچنے لگے۔

خیال کیجئے۔ ایک نوجوان جسے اندھیرے میں ڈر لگتا ہے اگر ایک ننھا بچہ اس کے ساتھ کر دیا جائے۔ تو وہ اس سے باتیں کرتا ہوا اندھیرا پار کر جائے گا۔ جس سے صاف عیاں ہے کہ اندھیرا بذاتہٖ کچھ بھی نہ تھا۔ یہ تو خود اس نوجوان کی کمزوری تھی۔ جسے ایک ننھے بچے نے بھی محسوس نہ کیا۔ اگر یہ شخص ذرا غور کرتا تو اسے محسوس ہوتا کہ اس خطرناک اندھیرے میں اُسے بچہ سنبھالنا دوبھر ہو جائیگا

اور وہ بجائے اندھیرا پار کرنے کے اور ہی مصیبت میں گرفتار ہو جائے گا۔

ذرا سے غور و فکر سے خوف کے اس تاریک ترین پہلو سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ اندھیرا کچھ بھی نہیں۔ محض روشنی کا نہ ہونا۔ بھلا اس میں ڈرنے کی کونسی بات ہے۔ جب ہم ذرا بھی سوچیں تو ہمیں خود اپنی کمزوری پر شرم آئے گی۔ کہ ہم نے کتنی کمزوری دکھائی۔

آپ نے بعض لوگوں کو دیکھا ہوگا۔ جو اکثر یہ بہانا کرتے ہیں کہ "صاحب۔ کیا عرض کروں۔ فلاں موقع پر تو میرا دماغ پھر گیا" یہ محض بہانا ہی ہے۔ کیونکہ دماغ کبھی نہیں پھرتا۔ اگر کوئی بچہ موقع کی نزاکت سے گھبرا کر پریشان ہو جائے تو خیر۔ مگر نوجوان آدمی وہ یہ کہنا کہ اس کا دماغ پھر گیا تھا۔ یہ تو کبھی قابل معافی نہیں ہو سکتا۔ یہ کھلم کھلا اعتراف شکست ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ بہانا کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ بچپن میں ہمیں جو کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ وہ کچھ اس قسم کی ہوتی ہیں کہ جن سے ہمارا دماغ خوف زدہ ہونے لگتا ہے۔ رات کا وقت ہوتا ہے نیند سے آنکھیں بوجھل ہوتی ہیں۔ اس وقت چراغ کی مدھم روشنی میں ایسی کہانیوں کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ وہ اثر بڑھتے بڑھتے ایک موہوم سا خوف بن جاتا ہے۔ اور یہی خوف پھر ہماری ساری زندگی پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ ایسے لوگ خود تو بزدل ہوتے ہی ہیں۔ وہ پھر اپنے تجربات بیان کر کے دوسروں کو بھی خوف زدہ

کرنا چاہتے ہیں۔

یہ ایک بیماری ہے۔ مگر لا علاج نہیں۔ اپنے اندر قوت ارادی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ اس کے ذریعے آپ کا کردار بلند ہو۔ پھر خوف کا دیو دھواں بن کر اڑ جائے گا۔ اس کے بعد کبھی ضرورت نہ رہے گی کہ ہم کہیں۔ "صاحب! میرا تو دماغ پھر گیا تھا"۔ یہ دراصل اعتراف ہے کہ میں خوف زدہ ہو گیا تھا۔ جب خوف ہی نہ رہا تو آپ کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔

اس کا ایک آسان علاج یہ بھی ہے کہ جو شخص اندھیرے سے ڈرتا ہو۔ اسے اندھیرے کمرے میں بار بار بھیجیں۔ جب وہ واپس آئے تو پھر اسے سمجھائیں کہ اندھیرے میں کچھ خوف نہیں ہوتا۔ روشنی کا ایک پہلو اندھیرا بھی ہے۔ اگر وہ شخص اندھیرے میں جانے سے ہچکچائے تو پھر اسے حکم دیجئے اور تعمیل کرائیے۔

ڈرپوک انسان جلد تعمیل حکم کرتے ہیں۔ ان کی فطرت کچھ اس قسم کی بن جاتی ہے کہ وہ اپنے سے طاقتور کی قوت ارادی سے متاثر ہوتے ہیں۔ اگر کبھی ان کے اندر رحم عدولی کا جذبہ پیدا بھی ہونے لگے۔ تو اس کا انجام انھیں خوفزدہ کر دیتا ہے۔ اس لیے ڈرپوک آدمی کو سب سے پہلے اندھیرے سے مانوس کرانے کی کوشش کیجئے۔ اس کا اثر اس کی طبیعت پر ہوگا۔ اور آہستہ آہستہ اس کا سارا ڈر دور ہوتا جائے گا۔ اگر ہو سکے تو کسی کے ساتھ اسے اندھیرے کمرے میں بھیجئے۔ اس کے سامنے ایسے موضوعات سے گریز کیا جائے۔ جن سے خوفزدہ ہونے کا احتمال ہو۔

ڈرپوک انسان مریض ہوتا ہے۔ مریض کے علاج کے ساتھ پرہیز لازمی جزو ہوتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہی ہوگا کہ ڈرپوک آدمی ایسی باتوں سے بچنا چاہتا ہے۔ جن سے اُسے خوف محسوس ہوتا ہے۔ اس کے سامنے دیو، بھوت، جن کا ذکر کرنا مضر ہوگا۔ اس کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ آپ اس کی سوچ کو ایسی ڈگر پر چلانے کی کوشش کریں۔ جس سے خوف کا اثر زائل ہونے لگے۔ جب یہ شخص اندھیرے کمرے میں جائے تو آپ باہر سے آواز دیتے رہیں اور اس سے ایسے سوالات پوچھیں۔ جن کا جواب وہ ذرا سوچ کے بعد دے سکے۔

توہمات اور خوف کا چولی دامن کا تعلق ہے۔ وہ لوگ جن کے سامنے چند مفروضات ہوں اور اُن مفروضات پر انھوں نے اپنے توہمات کی بنیاد رکھی ہوئی ہو۔ ان کے سامنے کسی قسم کی دلیل پیش کرنا فضول ہے۔ چھپکلی سامنے گر جائے تو ان کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ وہ اسے آنے والی مصیبت کا بدشگون قرار دیتے ہیں۔ بعض لوگ منگل کے دن کام کرنا منحوس خیال کرتے ہیں کئی تیرہ کا عدد بُرا سمجھتے ہیں۔ غرضکہ توہمات کا سلسلہ اس قدر دراز ہے کہ توبہ بھلی — عموماً جہلا کا طبقہ اس لعنت میں زیادہ گرفتار رہتا ہے مذہب سے ناواقفیت اور جہالت مل کر توہم پرستی کا باعث بنتے ہیں۔ توہم پرستی کا نتیجہ خوف ہے۔ اس خوف کا مقابلہ کرنے کے لیے

کردار کو اور زیادہ بلند کرنا ضروری ہوگا۔ جوں جوں آپ کو اپنی توہم پرستی کا احساس ہوگا۔ اور آپ اس سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ توں توں کردار خود بخود بلند ہوتا رہے گا۔ اور آپ اس غلامی سے نجات حاصل کر سکیں گے۔

توہم پرستی کو دور کرنے کے لیے ازبسکہ ضروری ہے کہ ہم اپنے اعتقادات کا بنظرِ غور جائزہ لیں۔ تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ واقعات جنھیں ہم نے توہمات بنا لیا ہے۔ محض اتفاقی باتیں تھیں۔ جن بھوتوں کے وہ قصے جن کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غیر معمولی مشاہدات ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم جتنی زیادہ چھان بین کریں گے۔ اسی قدر زیادہ ہمیں اپنی ضعیف الاعتقادی کا احساس ہوگا

آنکھیں ہوتے ہوئے نہ دیکھنا تو مشہور مثل ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر وہ شخص ہے جو آنکھیں رکھتے ہوئے صرف ایک ہی چیز کو دیکھنے کا عادی ہو۔ ایسا شخص ہر معمولی واقعہ کو بھی اپنی توہم پرستی سے متاثر کر دے گا۔ ایک صاحب ایک دن خاص سوٹ پہنے تھے۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس دن اُن کے سارے کام اچھے ہوتے رہے۔ اب انھوں نے اس سوٹ کو مخصوص کر لیا ہے جب کہیں کام کے لیے جانا ہوتا ہے تو وہ سوٹ پہن لیتے ہیں۔ اور یقین کرتے ہیں کہ ان کا کام ضرور ہو کر رہے گا۔ اب یہ سوٹ ایک تعویذ بن گیا ہے۔ توہم پرستی کا ایک نشان۔

توہم پرستی کی بنیاد ہمیشہ کسی سطحی مشاہدہ پر رکھی جاتی ہے۔

توہم پرست انسان کا دماغ کمزور ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا علاج دلیل اور غور کرنے میں ہی ہے۔ جب غور کرنے کی عادت زیادہ ہوتی جائے گی۔ تو ہم پرستی خود بخود کم ہونے لگے گی۔ ذرا ذرا سی بات پر رک جانا۔ کہ فلاں کام کرتے وقت یوں ہو گیا۔ لہذا یہ شگون برا ہے۔ کوئی عقلمندی نہیں۔ کام کرنے کے دو ہی نتائج ہوں گے۔ کامیابی یا ناکامی۔ ناکامی کے بعد پھر کوشش کرنے سے کامیابی لازمی ہے۔ بھلا یہ کونسی جواں مردی ہے کہ ذرا سی ناکامی کو اتنا بڑھایا جائے۔ کہ وہ ایک تو ہم پرستی بن جائے۔ جس کا خیال ہمت شکن ہو۔ ہمت اور غور و فکر ہی اس کا علاج ہیں۔ اس کے سامنے سارے وہم ہوا ہو جائیں گے۔

ڈرپوک سے ڈرپوک انسان کے بچے پر کچھ آفت آ جائے تو پھر دیکھئے اُسے نہ اندھیرا سوجھتا ہے اور نہ توہم پرستی۔ اس کی ساری توجہ بچے کو بچانے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اس وقت نہ اندھیرا روک بنتا ہے اور نہ کوئی خطرہ۔ بلکہ اس شخص کا دماغ سب کچھ بھول کر ایک نئی قوت کے ساتھ بروئے کار آتا ہے۔

خوف اور اس کی مختلف اشکال کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے ہم نے ساتھ ساتھ تجاویز بھی بتائی ہیں۔ اب ان ساری تجاویز کو پھر دہرایا جاتا ہے۔ تاکہ اُن سے مفید نتائج حاصل کیے جا سکیں۔

خوف کے مقابلے میں قوت ارادی کا ہونا ضروری ہے۔ مگر یہ قوت ایک دن میں پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ مسلسل محنت اور کام کرنے سے

پیدا کی جاتی ہے۔

عمل کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا جائے۔ تاکہ محض نظریہ سمجھنے کی بجائے اُسے عمل میں لایا جا سکے۔

کردار کی نشو ونما کے لیے سب سے بڑی چیز اپنی کمزوری کا احساس اور اسے دور کرنے کی سعی کا خیال ہے۔ جب یہ خیال پیدا ہو گیا۔ تو ہم عمل کی طرف متوجہ ہوں گے۔ وہ تمام خوف اور توہمات خود بخود کم ہونے لگیں گے۔ ہماری قوت ارادی بڑھے گی۔

خوف کے مقابلے کے لیے صرف ایک ہی حربہ کافی ہے۔ وہ ہے "قوت کردار" جو ہماری راہنمائی کرتی ہے کہ ہم سوچیں، فیصلہ کریں اور پھر اس پر عمل پیرا ہوں۔ جو شخص قوت کردار کا مالک ہو۔ وہ موقع کی نزاکت کا احساس رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مخالف حالات میں کس طرح عمل پیرا ہونا ہوگا۔ اور وہ زندگی کی کشمکش میں ہمیشہ بامراد اور کامران رہے گا۔

غصہ اور جوش

کسی بات پر عمل پیرا ہونے کے لیے سب سے پہلی چیز
قوت ارادی ہے۔ اگر یہ وقت کمزور ہو اور ہم چاہیں کہ ہمارا کردار
مضبوط ہو جائے تو یہ ممکن نہیں۔ بلکہ اس کے لیے ہمیں محنت کی
ضرورت ہوگی۔ تاکہ وہ کمی پوری ہو اور کردار بلند ہوتا جائے۔

باغبان کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ کسی پھل دار پودے کا بیج
بونے سے قبل وہ زمین کھودتا ہے۔ اور زمین میں جس قدر
جھاڑیاں اور دوسرے پودے ہوتے ہیں۔ ان کو نکال پھینکتا
ہے۔ جب زمین تیار ہو جاتی ہے تو پھر وہ بیج ڈالتا ہے۔ آبیاری
کرتا ہے۔ بیج پھوٹتا ہے۔ اس بیج کے ساتھ ساتھ کئی قسم کا گھاس

بھی اُگ آتا ہے۔ یہ گھاس دراصل پودے کی خوراک پر پلتی ہے۔ اس لیے باغبان گھاس کو کاٹتا رہتا ہے۔ تاکہ اصل پودا پنپتا رہے۔ مگر آپ نے دیکھا ہوگا۔ کہ جس قدر زیادہ گھاس وہ کاٹتا ہے اتنا ہی جلد اور گھاس اُگ آتی ہے۔ اور پودے کی نشو و نما میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔

جوں جوں گھاس سے پودے کو نجات ملتی جاتی ہے۔ وہ بھی بڑھنے لگتا ہے۔ پھر وہ وقت آتا ہے۔ جب پودا بڑھکر پھیل جاتا ہے۔ اس میں پتے آنے لگتے ہیں۔ یہ پتے گھاس پر اپنا سایہ ڈال کر اسے خشک کر دیتے ہیں۔ سایہ میں جو گھاس رہے گی وہ کمزور ہوگی

یہ مثال ہماری زندگی پر صادق آتی ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا کردار بلند اور مضبوط ہو تو لازمی ہے کہ ہم ان تمام کمزور خیالات کو کاٹ چھانٹ دیں۔ جو ہمارے کردار کے گرد اُگ آئے ہیں۔ کردار کی نشو و نما کے لیے از حد ضروری ہے۔ کہ کمزوری کا ہر خیال دماغ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ یہ گویا تخم ریزی کے لیے زمین تیار کرنا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ کمزور اور بودی قوت ارادی کبھی مضبوط نہیں کی جا سکتی۔ حالانکہ یہ محض خیال خام ہے۔ مضبوطی کے لیے کمزوری کا ہونا ضروری ہے۔ کمزوری کے بعد ہی مضبوطی آتی ہے۔ اس لیے قوت ارادی پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلی چیز ان کمزوریوں کا دور کرنا ہے جو اس راہ میں حائل

ہو رہی ہوں۔ جو خیال آگے بڑھنے سے روکے۔ اُسے فوراً دل سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔

اپنے ارادے پر قائم رہنے کی کوشش ہی قوت ارادی ہے۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے کوشش تو بہت کی۔ مگر اپنے ارادے پر قائم نہ رہ سکے۔ وہ لاشعوری طور پر قوت ارادی کے حاصل کرنے کی طرف جا رہے ہیں۔ کیونکہ جب آپ کو احساس ہوگا کہ آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ تو لازماً آپ اور کوشش کریں گے۔ آپ کی پوشیدہ قوتیں بروئے کار آئیں گی ایک دن میں قوت ارادی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور نہ ایک رات میں کردار بن جاتے ہیں۔ اس کے لیے مسلسل کوشش اور تگ و دو کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب آپ چاہیں کہ "بڑی بات" ہو جائے تو پہلے آپ "چھوٹی بات" کے لیے کوشش کریں۔

قوت کردار بعض اوقات اخلاقی بے عملی کے کھنڈرات سے پیدا ہوتی ہے۔ جب عمل بروئے کار آتا ہے۔ تو پھر اخلاقی بے عملی غائب ہونے لگتی ہے۔ اور انسانی ذہن کی خوابیدہ قوتیں نئی عمارت تیار کرنے لگتی ہیں اور ساری کمزوریاں دور ہو جاتی ہیں

اس ذہنی ارتقا کے لیے سب سے پہلا قدم اپنے آپ پر اختیار حاصل کرنا ہے۔ یہ اختیار آسان کام نہیں۔ بلکہ اس کے خلاف خود اپنے اندر ایک بغاوت پیدا ہونے لگتی ہے۔ خود اپنا دل مخالفت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کشمکش جو ہمارے اندر پیدا ہوتی ہے۔ بے فائدہ نہیں۔ بلکہ اس کے بطن سے وہ

بچہ پیدا ہوتا ہے۔ جو بڑھتے بڑھتے کردار بنتا ہے۔

داناؤں کا کہنا ہے کہ انسان کی سب سے بڑی فتح وہ ہے۔ جو اسے اپنے آپ پر حاصل ہوتی ہے۔ جب ہم اس فتح کی طرف بڑھتے ہیں تو ہماری راہ میں جس قدر جذبات کی رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ آہستہ آہستہ کم ہونے لگتی ہیں بلکہ یہی جذبات قابو میں آکر اپنا صحیح کام کرنے لگتے ہیں۔ ضرورت کے مطابق وہ عمل میں آتے ہیں۔ وہ سنسنی خیزی اور جذبات کی رو جو کبھی ہمیں بہا لے جاتی تھی۔ اب ہمارے قابو میں آکر قوت ارادی کی مضبوطی کا باعث بنتی ہے۔ پہلے پہل جب جذبات کو روکا جائے۔ تو ان کا ردّ عمل شدید ہوتا ہے۔ مگر ان پر ایک بار قابو پا لینے سے یہ شدت کم ہونے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ آپ میں ایک قسم کی "خلاقی بے رُخی" پیدا ہونے لگے گی۔ اب تخیل کی بے راہ روی کی بجائے سکون اور معاملہ فہمی آنے لگے گی۔

بعض لوگوں کو بُری عادت ہوتی ہیں۔ کہ وہ ہر ایک بات کے نتائج کا ہمیشہ تاریک پہلو لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ نتائج اس قدر بڑھ چڑھ جاتے ہیں۔ کہ ان کی وحشت اُنھیں سراسیمہ کر دیتی ہے۔ ایک خاتون اسی عادت میں مبتلا تھیں۔ انھیں خبر ملی کہ ان کی بہن بیمار ہیں۔ وہ بیچاری سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ اُن کا ذہن ان کے سامنے بہن کی موت لے آیا۔ پھر اس کے بچے یاد آنے لگے۔ پھر بچوں کی سوتیلی ماں آ گئی۔ وہ خالہ تھیں۔ ان کا دل کڑھنے لگا۔ چنانچہ وہ کئی دن پریشان رہیں۔ آخر دوسری اطلاع ملی۔ کہ انکی بہن کو

اب صحت ہے۔ چنانچہ وہ پہلا واقعہ بھول گئیں۔ اب ان کا تخیل بہن کی تندرستی کے گرد گھومنے لگا۔

اگر اس خاتون کی قوت کردار مضبوط ہوتی تو بیماری کی خبر کا ردعمل بالکل دوسرا ہوتا۔ وہ بیماری کی خبر سن کر موت کا خیال نہ کرتیں۔ بلکہ صحت کے متعلق اطلاع کا انتظار کرتیں۔

اس واقعہ کو سن کر آپ شاید کہہ دیں کہ کمزور کردار کا انسان دوسری طرح سوچ ہی نہیں سکتا۔ یہ درست ہے۔ مگر اس سے توقع کون رکھتا ہے۔ کہ وہ فوراً مضبوط کردار کا مالک بن جائے۔ بلکہ ہم تو اس سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ دھیرے دھیرے حل پیدا ہو۔

جب کبھی ایسا موقع آ جائے جب ایک کمزور کردار کا انسان قوت ارادی کی تکمیل کی راہ میں ایسے مقام پر آ کر رک جائے۔ جہاں حالات اس کی ہمت کو توڑنے لگیں۔ تو ایسی صورت میں اس سے بچ نکلنے کی ایک ہی راہ ہے۔ وہ شخص پریشان ہونے کی بجائے اپنے خیالات کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کی کوشش کرے۔ اور یہ یوں ہو سکتا ہے۔ کہ وہ فوراً کسی دوسرے کام میں لگ جائے اور تھوڑی دیر کے لیے اس کام سے توجہ ہٹا لے۔ اس طریق پر شاید کسی کو اعتراض ہو کہ ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ اس لیے اسے ذرا تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔

فرض کر لیجے آپ پریشان ہیں۔ آپ کے سامنے ایک ایسا سوال ہے جس کا حل نظر نہیں آتا۔ آپ کی تمام قوت ارادی کے باوجود

آپ گھبرا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں دو ایک خطوط لکھنے کی کوشش کیجئے۔ اس سے توجہ بٹ جائے گی۔ خطوط لکھتے وقت یہ خیال رکھیں کہ آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہے۔ بلکہ آپ وہی بات لکھ رہے ہیں جو آپ کو لکھنی چاہیئے تھی۔

یہ ایک قسم کی مشق ہو گی۔ جو ہم اپنے تھکے ہارے دماغ کو کرا رہے ہیں۔ اس سے دماغ کو تھوڑی دیر کے لیے ایک تو آرام مل جائے۔ دوسرے وہ اپنے منتشر خیالات کو یکجا کر سکے گا۔ جب ہم وہ خطوط مکمل کر چکیں گے۔ تو یقیناً ہمارے خیالات میں سکون ہو گا ہمارے جذبات کی وہ شدت کم ہو چکی ہو گی۔ اور ہم ٹھنڈے دل سے پہلے مسئلہ پر غور کر سکیں گے۔ بالآخر آہستہ آہستہ وہ پریشانی مٹتی جائے گی۔

پریشانی کے بعد خاموشی چھا جائے۔ تو اس وقت واقعات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اس وقت ضروری ہے کہ ہم واقعات کا روشن پہلو سامنے رکھیں۔ امید کو اپنا راہ نما بنائیں۔ ہر بات کا تاریک پہلو انسان کو یاس کے گہرے غاروں میں ڈھکیلتا ہے۔ جو لوگ مضبوط دل و جگر کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کے ذلیل ترین حادثات میں سے ان کا علاج ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ایسے موقعوں پر امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

جہاں یاس حوصلہ شکن ہے۔ وہاں سراسر امید کا سہارا بھی لے ڈوبتا ہے۔ امید کی روشنی صرف راہنمائی کے لیے چاہیے

اس کے بعد بلند ارادے اور قوت عمل کی ضرورت ہے۔ سراسر امید کا سہارا خود فریبی کی حد تک جا پہنچتا ہے۔

زندگی کے واقعات کا مقابلہ کرنا کردار پیدا کرتا ہے۔ ان سے پہلو تہی کرنا یا ان سے آنکھیں بند کرلینا کمزوری کی علامت ہے۔ محض جذبات کے بھروسے پر عمل کرنا ٹھیک نہیں۔ بلکہ سوچ سمجھ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنا اور ارادہ مضبوط رکھنا کردار پیدا کرتا ہے۔

کمزور کردار کی ایک علامت غصہ ہے۔ وہ غصے کے ذریعے عارضی سی تسکین حاصل کرلیتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے نہیں کہ غصہ کا یہ اظہار ہی ان کی کمزوری ہے۔ پھر غصہ سے دماغ اور بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ جس بات پر غصہ آتا ہے۔ وہ دراصل کوئی خلاف مرضی بات ہوتی ہے۔ اگر ہمیں بار بار غصہ آنے لگے۔ تو اس سے طبیعت میں ہیجان سا پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اور یہ ہیجان ذرا ذرا سی خلاف مرضی بات سے زیادہ ہونے لگتا ہے۔

غصہ کو اگر آگ کی ایک چنگاری سے تشبیہ دیں تو زیادہ موزوں ہوگا۔ کیونکہ اگر چنگاری کے گرد کوڑا رکھ کر اسے ہوا دی جائے تو اسی چنگاری سے شعلے نکلنے لگتے ہیں۔

غصہ کے بالمقابل جوش ہے۔ جوش آناً فاناً آتا ہے اور پھر جب وہ چیز سامنے سے ہٹ جائے جس نے جوش دلایا تھا۔ تو جوش فوراً اتر جاتا ہے۔ کمزور دماغ کے آدمی کو جوش بہت جلد آتا ہے اور پھر اس کا جوش ختم بھی بہت جلد ہو جاتا ہے۔

یہ غصہ، ہیجان اور جوش کچھ ایک ہی نوع کے ہیں۔ اُن کے

آنے سے تو کمزور آدمی بھی آپے سے باہر ہونے لگتا ہے۔ مگر جب غصہ اور جوش اتر جائیں۔ تو پھر اس شخص کی حالت عجیب ہوتی ہے یہ ایک بیماری ہی تو ہے۔ اس کا علاج کردار کے بلند کرنے سے ہی ہوگا۔ تاکہ غصہ اور جوش ہمیں قابو میں نہ کرلیں۔ بلکہ ہم انھیں اپنے قابو میں رکھیں۔ ایک کمزور آدمی کا جوش اور ایک مضبوط آدمی کا جوش دو مختلف چیزیں ہیں۔ ان میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

ایک مثل ہے کہ جب غصہ آنے لگے تو بات کرنے سے قبل سات بار زبان منھ میں ہلاؤ۔ یہ بات ہے بھی درست۔ جب غصہ آنے لگے تو فوراً اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش ضروری ہے سات بار زبان ہلانے کی اصل روح غصے پر قابو پانا ہے۔ جب طبیعت میں غصہ پیدا ہو۔ تو فوراً گفتگو کا موضوع بدل لیجئے۔

ایک جرمن فلاسفر نے ایک شخص کا قصہ لکھا ہے جو ہر وقت اپنے پاس ایک چھوٹی سی زنجیر رکھتا تھا۔ اور خاموشی سے اُسے ہر وقت ہلاتا رہتا۔ ایک دن کسی نے اس سے اس زنجیر کی بابت پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔

"حضرت! یہ زنجیر میری لگام ہے۔ میں زود رنج ہوں۔ غصے میں اکثر مجھ سے ایسی نادا جب باتیں ہو جاتی ہیں۔ جن کیلیے بعد میں مجھے ندامت ہوتی ہے۔ اس لیے جب مجھے غصہ آنے لگتا ہے تو میں چند لمحات تک غصے کو ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور پھر میں سو بار زنجیر کی کڑیوں کو گنتا ہوں۔ اس دوران میں مجھے غصے پر پورا قابو ہو چکا ہوتا ہے۔ اور میں موقع کی نزاکت کو جان جاتا ہوں

میرے اعصاب پر مجھے قابو ہوتا ہے۔ میرے اندر ہیجان ختم ہو جاتا ہے۔ میں دماغ کے آئینے میں پوری طرح حالات کا عکس دیکھنے لگتا ہوں"۔

وہ لوگ جو کردار بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے مندرجہ بالا مثال قابل تقلید ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ زنجیر لیے پھریں۔ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تحمل، سکون اور فکر سے کام لیں۔ زندگی کے اس نازک ترین موقع پر بھی جب کہ ہمارے اندر جوش اپنی انتہائی بلندیوں پر ہو تو ہم اس پر قابو رکھیں۔ یہ کام کوئی ایسا نہیں جو نہ ہو سکتا ہو۔ بلکہ روزمرہ کے واقعات ہی کو لے کر ہم اپنے تئیں تربیت دے سکتے ہیں۔ مثلاً غصے کی حالت میں دس تک گننے لگیں۔ کوئی جان نہ سکے گا۔ اور آپ کا غصہ بھی مدھم ہوتا جائے گا۔

اپنے لیے آپ کوئی طریق سوچ لیجئے۔ اس پر عمل کرتے رہیں تو آپ دیکھیں گے کہ آپ غصے ایسی حالت پر کس خوبی سے قابو پا سکیں گے۔

یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے۔ کہ کردار کی کمزوری آسانی سے دور کی جا سکتی ہے۔ صرف استقلال کی ضرورت ہے۔ اس کی راہ میں رکاوٹیں ضرور ہوں گی۔ مگر یہی رکاوٹیں آگے بڑھنے کے لیے نئی منزل کا کام دیں گی۔ اس پر کردار کی عمارت زیادہ مضبوط بنے گی۔

خوشی

خوشی ایک انسانی جذبہ ہے۔ ایک بات ایک شخص کیلیے خوشی کا باعث ہو سکتی ہے۔ مگر دوسرے کے لیے رنج کا۔ خوشی کا تصور ہر ایک انسان کے لیے مختلف معنی رکھتا ہے۔ بعض لوگوں کی خوشی زندگی کے پر سکون ہونے میں ہے۔ بعض لوگ کامیابی کیلیے کوشاں ہوتے ہیں۔ ان کی خوشی دولت اور عزت میں ہے۔ بعض خوشی کی انتہا جاہ و جلال اور شان و شوکت میں سمجھتے ہیں۔

خوشی کے ان مختلف مقامات تک پہنچنے کے لیے صرف ایک ہی ذریعہ ہے۔ آگے بڑھنا۔ آگے بڑھنے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ ہے کردار کی مضبوطی۔ اس کے ذریعے قوت ارادی ملتی ہے۔

قدم آگے بڑھتا ہے۔ آگے بڑھتا ہے۔

محنت اور مزدوری زندگی کی تلخ ترین حقیقت ہے۔ لیکن جب یہی تلخ حقیقت قوت کردار کے ذریعے عمل پیرا ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ کامیابی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی کامیابی خوشی ہے۔

دنیا میں بنا کام کئے زندہ رہنا محال ہے۔ ہر کسی کو کام کرنا ہی ہوتا ہے۔ جتنا کوئی کام کرے گا۔ اتنا ہی اسے اس کا پھل ملیگا۔ لیکن اگر یہ کام (جسے ہر حال میں کرنا ہوگا) بے دلی سے کیا گیا۔ تو اس سے کام مشکل ہو جایگا۔ جب یہی کام کردار کی ان ساری صفات کو جن کا ذکر ہم گذشتہ صفحات میں کر آئے ہیں۔ عمل میں لا کر کیا جائے۔ تو اس سے ایک تو کام دلچسپ بن جائے گا۔ اور اس کے سرانجام دینے سے ہمیں خوشی حاصل ہوگی۔

بے دلی سے جو کام کیا جائے۔ اس کا نتیجہ کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ کام زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اور اس پر ہاتھ ڈالتے خوف محسوس ہوتا ہے۔ اگر یہی کام ہنستے کھیلتے شروع کیا جائے۔ تو اس سے دل میں ایک خاص قسم کی راحت محسوس ہوگی۔ کام کرنے کو جی چاہے گا۔ اس کے نتائج بھی اچھے ہوں گے۔ حقیقی مسرت کا راز اسی میں ہے کہ جو کام بھی کرنا ہو اسے خوشی سے کیا جائے۔ کام میں انہماک پیدا کیا جائے۔ تاکہ کام دلچسپی کا ایک سامان بن جائے۔

اگر ہم زندگی کے اس راز کو نہ سمجھ سکیں۔ تو پھر ہماری زندگی سے خوشی مفقود ہو جائے گی۔ کیونکہ کام کے بغیر زندگی محال ہے اور

اگر کام مصیبت بن جائے۔ تو پھر زندگی ایک عذاب ہی ہے۔
ناکام اور کامیاب شخص میں صرف اسی قدر فرق ہے۔ کہ ایک روزمرہ زندگی میں حالات کے رحم پر ہے۔ جو ہوتا ہے۔ ہوتا رہے۔ وہ مصیبت کے دن کاٹ رہا ہے۔ مگر دوسرا شخص وہ اپنے کردار کی وجہ سے قوت ارادی کو کام میں لاکر زندگی کے واقعات کو اپنے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کامیاب شخص کے لیے زندگی دلچسپی کا سامان ہے۔ وہ کام کرتا ہے اور اچھے نتائج حاصل کرتا ہے۔

خوشی خود بخود نہیں آتی۔ بلکہ اس کو لانے کے لیے اس کی تمنا کی جاتی ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم نے خوشی کی تمنا کرلی اور زندگی کی ساری مشکلات پر قابو پالیا۔ نہیں بلکہ ہمارے کہنے سے مراد یہ ہے۔ کہ جب ہم تمنا کرتے ہیں تو ہمارے اندر خوشی کے حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ جب ہم اسے تھوڑا بہت حاصل کرنے لگتے ہیں۔ تو اطمینان قلب ہونے لگتا ہے۔ ہمیں اپنے آپ کی طرف توجہ کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ ہم اپنے دل کی گہرائیوں میں خوشی پاکر مسرور ہوتے ہیں۔ لیکن کمزور کردار کا مالک ہمیشہ دوسروں کی طرف توجہ رکھتا ہے۔ کیونکہ اسے اپنے کمتر ہونے کا احساس دوسروں کی طرف متوجہ رکھتا ہے۔ جو شخص اپنی اچھائیوں کو ہمسائے کی اچھائیوں میں مدغم کرتا ہے۔ وہ زندگی کی سب سے بڑی بھول کا مرتکب ہوتا ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ خوشی ایک اضافی حالت کا نام ہے۔

اس لیے اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہمیں موقع محل اور دیگر حالات کا خیال رکھنا چاہیے۔ جس بات میں ایک نوجوان کی خوشی ہو وہ شاید زیادہ عمر کے آدمی کے لیے پسندیدہ نہ ہو۔ اسی طرح بوڑھوں کی دلچسپیاں جوانوں کو ناک بھوں چڑھانے پر مجبور کرتی ہیں۔ رنگین مزاجوں کی خوشی کے سامان متدین لوگوں کے لیے نفرت کا باعث بنتے ہیں۔

غرض اسی طرح اگر دیکھا جائے۔ تو دنیا کے تمام افعال ایک کے لیے اگر مسرت لاتے ہیں۔ تو دوسرا ان سے رنجیدہ بھی ہو سکتا ہے وہ لوگ جن کا کردار بلند ہے۔ وہ موقع محل خوب سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اصل خوشی کا منبع کام ہے۔ لہذا وہ اسی منبع سے خوشی حاصل کرتے ہیں۔ ان کے لیے چاروں طرف خوشی ہی خوشی ہے

خوشی کا سب سے بڑا دشمن کاہلی ہے۔ سستی اور کاہلی تمناؤں کے لیے خودکشی کے مترادف ہیں۔ تمنا اور آرزو کے بغیر زندگی بیجان ہے۔ سست انسان ہمیشہ زندگی کی دوڑ سے دور رہنا چاہتا ہے کام سے جان چراتا ہے۔ اور پھر جب خوشی ان سے دور ہو جاتی ہے تو وہ خوشی کے لیے واویلا کرتا ہے۔ فلک ناہنجار کے شکوے کرنے لگتا ہے۔

کسی کا مقولہ ہے کہ "جھونپڑی کی تمنا کرنا محلات کے ماتم سے بہتر ہے" کسی چیز کی تمنا کرنا ہمیں اس کے حاصل کرنے کی طرف لے جاتا ہے۔ ہم میں تگ و دو کی قوت پیدا کرتا ہے۔ ہم اس کیلئے کوشش کرتے ہیں۔ اس کے حاصل کرنے کی خواہش روز بروز

بڑھتی ہے۔ لیکن جب ہم کھوئی ہوئی باتوں کے لیے بیٹھ کر رونے لگیں۔ تو ہماری قوت عمل سلب ہو جاتی ہے۔ ہمارا ذہن بے کار ہو جاتا ہے۔ آگے بڑھنے کی بجائے ہم ماضی کی یاد میں حال اور مستقبل کو گنوا دیتے ہیں۔

ہم بیکار بیٹھکر افسوس کرتے رہنا ایک فضول کام ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے خوشی کی توقع حماقت سے کم نہیں۔ جو شخص ماضی کے تجربے پر حال کی بنیادیں استوار کرتا ہے۔ اس کا مستقبل بھی روشن ہوگا۔ اور اسی کے لیے خوشی ہے۔

افسوس کرنا حماقت ہے۔ مگر جب کردار بلند ہو تو یہ افسوس بھی ایک صفت بن جاتی ہے۔ زندگی میں شکست و فتح کا چکر چلتا رہتا ہے۔ جو شخص اپنی شکست پر غور کرتا ہے اور اُن کمزوریوں پر افسوس کرتا ہے۔ جو اس سے سرزد ہوئیں اور جن کی وجہ سے اُسے شکست ہوئی۔ تو یہ افسوس کرنا درحقیقت کردار کا ہی ایک پہلو ہے۔ اس سے کردار بلند ہوتا ہے۔

صحت کا اچھا ہونا بھی خوشی کا باعث بنتا ہے۔ لیکن صحت اور کردار لازم و ملزوم ہیں۔ کردار ہمیں بے اعتدالیوں سے روکتا ہے۔ زندگی میں اعتدال قائم رکھنے سے صحت بنتی ہے۔ اور صحت سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ ایک شخص جس کے پاس ساری دنیا کے خزانے تو موجود ہوں۔ مگر وہ تندرستی سے محروم ہو۔ وہ خوش رہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

صحت کے برقرار رکھنے کے سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحت قائم رکھنے کے کیا ہم ذمہ دار ہیں۔ کیا ہماری بہت سی مصیبتوں کا باعث صحت کی خرابی نہیں۔؟

اگر ہم اپنی روز مرہ کی زندگی میں اعتدال برتیں۔ کھانا اتنا کھائیں جو ہمارے لئے ضروری ہے۔ پوری طرح نیند کریں۔ کام کے بعد آرام کریں۔ ان تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھیں۔ جن کا اثر صحت پر پڑتا ہے۔ تو اس کا نتیجہ اچھا ہوگا۔ طبیعت بشاش رہے گی۔ چڑ چڑاپن پیدا نہ ہوگا۔

جو لوگ ہر وقت خوشی کے درپے رہتے ہیں اور اُسے حاصل کرنے کے لیے وہ چیزوں کی عارضی چمک دمک میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ غلطی پر ہیں۔ ان کے کردار کی کمزوری انھیں خوشی کی بجائے محض سراب دکھاتی ہے۔ وہ چیزیں جنھیں وہ خوشی سمجھ کر کرتے ہیں دراصل زندگی سے فرار کی صورتیں ہوتی ہیں۔ ورنہ اگر وہ ذرا بھی غور کرتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ اس تگ و دو میں وہ اپنی قوت ضائع کر رہے ہیں۔ جس خوشی کی انھیں تلاش ہے۔ وہ خوشی نہیں محض دھوکا ہے۔

ایسے حالات میں انسان کا ہوشیار رہنا لازمی ہے۔ تاکہ وہ دھوکہ نہ کھا سکے وہ جان سکے کہ جن لمحات کو وہ خوشی حاصل کرنے کے لیے گزار رہا ہے۔ کیا وہ ضائع تو نہیں ہو رہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کا روکنا ضروری ہوگا۔ مگر اس کو روکنے کے لیے ہمت مردانہ کی ضرورت ہے۔ ورنہ عارضی خوشی کا سراب اتنا رنگین ہوتا ہے کہ اس سے دھوکہ کھا جانا آسان ہے۔ جب تک کردار بلند نہ ہو۔ ہمیں

اپنے آپ پر پورا قابو نہ ہو۔ تب تک ایسا کرنا مشکل ہو گا۔

قوت کردار کے بل بوتے پر ہم چوکس رہ سکتے ہیں۔ اپنے اعمال کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ جب کردار بلند ہو گا۔ تو ہمارے افعال کا نتیجہ خوشی کا باعث بنے گا۔ ہم زندگی کی کشمکش میں بڑھتے جائینگے ہمارا ہر قدم جو آگے اٹھے گا۔ وہ خوشی کی منزل کی طرف ہو گا۔

باب نواں

کاروبار

جرمنی کے مشہور فلاسفر شوپن ہار کا کہنا ہے کہ "روپیہ تمام ممکن برائیوں کی راہ میں ایک روک ہے"۔ اس زمانے میں جبکہ دولت کو بُرا کہا جا رہا ہے شوپن ہار کا یہ قول عجیب سا معلوم ہوگا مگر یہ ہے حقیقت پر مبنی۔ جسے ہم برا سمجھتے ہیں۔ وہ سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے۔ روپیہ نہیں۔ روپیہ تو قاضی الحاجات ہے۔

فلاسفر نے روپے کو تمام ممکن برائیوں کا علاج نہیں کہا۔ بلکہ برائیوں کی راہ میں ایک روک کہا ہے۔ غربت کو لیجئے یہ ایک عالمگیر مرض ہے۔ اس کا علاج ہی روپیہ ہے۔ مفلسی کے ساتھ دکھ اور درد کی ایک طویل داستان ہے۔ انسان کو

کن کن عذابوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ یہی حال بھوک کا سردی اور گرمی کی شدت کا ہے۔ بیماری روپے سے دور نہیں کی جا سکتی۔ مگر علاج کے ذریعہ بیماری کی تکلیف کو کم اور مریض کے لیے صحت کے زیادہ مواقع بہم پہنچائے جا سکتے ہیں روپے کے ذریعے ہم دوسروں کی امداد کر سکتے ہیں۔ انھیں دکھوں سے نجات دلا سکتے ہیں۔ روپے کے ذریعے ادب، فن، علم اور دنیا کی ہر نعمت حاصل کی جا سکتی ہے۔ روپے کے ذریعے ہی انسان خدا کا محبوب بن سکتا ہے۔

روپے کے ذریعے ہم تکلیف کی بجائے ایک مضبوط ردعمل مہیا کر سکتے ہیں۔ اس سے ہمارے دماغ کی پریشانی دور ہو سکتی ہے۔ بہتر طریق سے سوچ سکتے ہیں۔

آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں یا نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک محلوں میں زیادہ آرام دہ ہوتا ہے۔ جھونپڑی میں سسک سسک کر مرنے سے۔ محلات میں مرض کے مداوا کے لیے کون سی کمی ہوتی ہے۔ دل کو تسکین رہتی ہے۔ لیکن جھونپڑی میں دوائی کے لیے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا خود ایک عذاب ہے۔ ایک قابل طبیب کی موجودگی مرض کو کم کر دیتی ہے۔ کہیں دوائی کیلیے پیسہ نہ ہونے کا خیال مرض کی تکلیف کو بڑھاتا ہے۔

روپے کے ذریعے اگرچہ صحت نہیں خریدی جا سکتی مگر اس سے تسکین ضرور مل جاتی ہے۔

اس زمانے میں جب انسان ترقی کے مراحل بڑی تیزی

طے کر رہا ہے۔ غریب ہونا ایک لعنت ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی شخص بدقسمتی سے اس لعنت کا شکار ہو چکا ہے۔ تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے دور کرنے کی پوری کوشش کریں۔ اس کے لیے وہ شریفانہ اور جائز راستے سوچیں۔ جن سے یہ لعنت دور کی جا سکے اگر ہمیں قدرت کی فیاضی سے دولت ورثے میں ملی ہے۔ تو پھر اس کا جائز استعمال اور اس کا محفوظ کرنا بھی ضروری ہے

ہمارے اس زمانے میں زندگی کے حالات کچھ ایسے دشوار ہو گئے ہیں کہ اب کوئی بے کار نہیں رہ سکتا۔ وہ لوگ بھی جو چاندی سونے میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بھی اگر نکمے رہیں تو ان کی بربادی لازمی ہو گی۔ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حسن انتظام رکھیں۔ تاکہ ان کی جائداد اور مال دولت برباد ہونے سے محفوظ رہ سکے۔ دولت جتنی زیادہ ہوتی جائے گی۔ اس کے لیے دولت کے مالک کو زیادہ کام کرنا پڑے گا۔ وہ لوگ جو اپنا کاروبار دوسروں کے ہاتھوں میں دے کر خود عیاشی کرنے لگیں۔ وہ زیادہ دیر تک لکھ پتی نہیں کہلا سکتے۔ بلکہ چند برس کے بعد وہ دوسروں کے محتاج ہوں گے۔

یہ روزمرہ کے حالات ہیں۔ لوگ بنتے اور بگڑتے ہیں۔ یہ قاعدہ ہے کہ انفرادی مفاد دوسروں کے مفاد سے مقدم کیا جاتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک کارندہ محنت اور دیانتداری سے کمائے اور اس کا مالک عیاشی کرے۔ وہ بھی تو سوچے گا کہ اس کی کمائی برباد ہو رہی ہے۔ وہ کیوں نہ اس سے مستفید ہو

کسی فرد سے یہ توقع رکھنا ہی فضول ہے۔ کہ وہ اپنے مفاد کو دوسروں کے لیے بلا کسی معاوضہ کے قربان کرتا رہے۔

جو دولت مند شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کی دولت محفوظ رہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ اس کا انتظام وہ خود کرے۔ جو شخص کاروبار کے معاملہ میں محتاط ہے۔ وہ کبھی زندگی کی تگ و دو میں ناکام نہیں رہ سکتا۔ فن کار (Artist) ایک ایسی ہستی ہے۔ جو دولت سے بے نیاز ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس کے شہ پارے کاروباری لحاظ سے بہتر قیمت پانے لگیں۔ تو اس کی پریشانیوں میں کمی ہو سکتی ہے۔ اور وہ وقت جو کاروبار میں ضائع کرتا تھا۔ اپنے فن میں دے سکتا ہے۔

جو شخص سارا دن صرف اس لیے کام کرتا ہے کہ اس سے وہ اپنا پیٹ پال سکے۔ اس سے کبھی کسی شہ پارے کی امید ہو سکتی ہے۔ اس کی ساری ذہانت تو ضائع ہو جاتی ہے۔ اگر یہی شخص کاروبار سے واقف ہے۔ تو وہ اسی کام کو اس طریق سے کرے گا۔ کہ اس سے اُسے آمدنی بھی زیادہ ہو اور وہ دنیا کے سامنے بہترین چیز پیش کر سکے

ایسی مثالیں عام ہیں کہ جن ذہین لوگوں نے اپنی خداداد قوتوں سے کام لیا۔ انھوں نے آرام سے زندگی بسر کی۔ مشہور ڈرامہ نویس شکسپیر جہاں ڈرامے لکھتا تھا۔ اور انگریزی ادب کو مالا مال کر رہا تھا۔ وہاں وہ اپنے تئیں خوشحال رکھنے کے لیے تھیٹر کا منیجر بھی تھا۔ ہمارے زمانے میں جارج برنارڈ شا ہیں۔ ان کا فن عالمگیر حیثیت رکھتا ہے۔ مگر وہ ایک ایک لفظ کی قیمت لیتے ہیں۔

مسٹر چرچل جہاں قوم کے لیے خرابیاں کرتے آئے ہیں۔ وہاں اُنھیں قوم کی احتیاج سے بچانے والا اُن کا فن مضمون نگاری ہے۔

ہندوستان میں ایسے فن کار ابھی تھوڑے ہیں۔ جن کا فن کاروبار سے آشنا ہے۔ ممکن ہے یہ حالت جلد آجائے ہماری ہاں فن نواز دوستوں کی حالت ایسی نہیں۔ جن پر بھروسہ کر کے فن کار کاروبار میں کامیاب ہو۔ اس زبوں حالی کی مثال نذرالاسلام ہیں۔ ان کی بدحالی پر آنکھیں خون بہاتی ہیں۔

کاروبار کو سمجھنا اور اس کے ذریعے زندگی کو بہتر بنانا ازحد ضروری ہے اس کے لیے محنت کی ضرورت ہے۔ زندگی کے ہر قدم پر ردوبدلے کی ضرورت ہے۔ تاکہ قدم آگے ہی آگے اٹھتا رہے ورنہ اس کے بغیر جمود کا ڈر ہے۔

بعض لوگ روپیہ کا نام سنتے ہی یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ گویا یہ کوئی ایسی چیز ہے۔ جو ہمیں زندگی کی دوڑ سے نکال کر آرام طلبی کی طرف لے جائے گی۔ حالانکہ روپیہ وہ ذریعہ ہے۔ جس کے سہارے ہم زندگی کے فرائض کو احسن طریق پر سرانجام دے سکتے ہیں۔ اس لیے ہر ایک انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے طریق سے عمر کے کسی خاص حصے میں روپیہ جمع کرنے کے لیے کوشش کرے۔

روپیہ کی اہمیت کا اندازہ لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ اپنی ضروریات زندگی کے لیے روپیہ کماتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی اولاد کے لیے روپیہ جمع کرتے ہیں۔ تاکہ انکے بعد

وہ آرام سے زندگی بسر کر سکیں۔ بعض لوگ صرف اس لیے دولت جمع کرتے ہیں کہ وہ اس کے ذریعے قومی خدمت کر سکیں۔ کیونکہ انھیں جتنی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ وہ قوم کو سدھارنے میں صرف کرنا جائز سمجھتے ہیں۔

عام لوگوں کے لیے روپیہ کا مقصد صرف وقتی خوشی اور مسرت ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی زندگی کا زاویہ نگاہ محدود ہے۔ مگر وہ لوگ جو زندگی بسر کرنا جانتے ہیں۔ اور جو سماج کی تشکیل میں بالواسطہ یا بلاواسطہ مدد ہوتے ہیں۔ وہ لوگ زندگی کو کاروباری نکتہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے لیے روپے کا پیدا کرنا زندگی کو ایک قدم آگے بڑھانے کے مترادف ہے۔ روپے کا لین دین جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی خوش حالی کا دور دورہ ہوگا۔

کاروبار خواہ کسی نوعیت کا ہو۔ مگر اس کی کامیابی کے لیے بہت سی صفات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن میں سے سب سے پہلی اور ضروری صفت قوتِ کردار ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے ہم بڑی سے بڑی تحریص کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جس شخص کا کردار بلند ہوگا وہ اپنے مدمقابل پر ہمیشہ فوقیت حاصل کرے گا۔ کاروبار کے لیے طبیعت کا سکون، تحمل اور اپنے آپ پر قابو رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جو شخص ان صفات کا مالک ہے وہ ایک کامیاب کاروباری آدمی ہے۔ یہ ساری صفات قوت کردار کا نتیجہ ہی ہو سکتی ہیں۔

سکون (calmness) اور منافقت دو چیزیں ہیں۔ سکون کے ذریعے کاروباری لوگ اپنے رنج و غصے کو برداشت کرتے ہیں

اور کاروبار کے مستقبل کے پیش نظر تحمل سے کام لیتے ہیں ایسے شخص کی مثال اس عورت کی سی ہے۔ جس کے چہرے پر ایک موٹا نقاب اس کے خد و خال کو چھپا رہا ہو۔ مگر منافقت۔ وہ ایک بوسیدہ اور کھوکھلی دیوار ہے۔ جس پر رنگین کاغذ چسپاں کر کے دیکھنے والے کو دھوکہ دیا جا رہا ہے۔

سکون اور منافقت بالکل دو متضاد راستے ہیں۔ جذبات پر قابو پانے کے بعد طبیعت میں سکون پیدا ہوتا ہے۔ ایسے شخص کی قوت فیصلہ زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اُسے غصے پر قابو ہوتا ہے۔ وہ حالات کا فوراً جائزہ لے کر اس کے مطابق کام کرتا ہے طبیعت کی اس سکون پسندی کا نام اگر ہوشیاری رکھا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔

ہوشیاری اپنے کاروبار میں ہمیشہ اختصار سے کام لیتی ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جو کردار کی بلندی سے پیدا ہوتی ہے وہ شخص جو ہوشیار نہیں ہے۔ وہ ایک کام کرنے سے قبل اگر اس کے سارے نشیب و فراز سوچنے لگے تو وہ کافی وقت ضایع کرے گا۔ مگر ہوشیار شخص کا ذہن اتنا نشو و نما پا چکا ہوتا ہے۔ کہ وہ فوراً حالات کا جائزہ لے کر اس سے نتائج اخذ کر لیتا ہے۔ اسی سے ہی بالغ نظری پیدا ہوتی ہے۔ بھلا ان صفات کا مالک کام کاروباری آدمی ہو سکتا ہے۔

ہم نے بالغ نظری کا ذکر کیا ہے۔ اس صفت کا کاروبار پر کافی اثر ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے ہم اس عمل کے نتائج مرتب

کر سکتے ہیں۔ جس کی طرف طبیعت کے سکون نے ہماری رہنمائی کی تھی۔ بالغ نظری اور کردار کی بلندی لازم و ملزوم ہیں۔ کردار کی بلندی کے ذریعے قوت ارادی بروئے کار آتی ہے۔ اور قوت ارادی اور بالغ نظری مل کر ہمیں اپنے مقصد کی طرف لے جاتی ہیں

اندھیری رات میں معمولی سی روشنی بھی کافی ہوتی ہے۔ اس سے ہم اردگرد کی چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ یہی حال بالغ نظری کا ہے۔ اس کے ذریعے ہم ناموافق حالات میں بھی سوچ سکتے ہیں خیالات پر حالات کے بادل امنڈتے رہیں۔ دھند چھا جائے۔ مگر بالغ نظری کی شعاع روشنی کے منارہ کا کام دے گی۔ ہم خطرات کو محسوس کر سکیں گے۔ آنے والے حوادث ہمیں پریشان نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ ایک چیز کا قبل از وقت علم ہو جانا اس کی شدت کو کم کر دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے۔ جس کے ذریعہ ہم مدافعت کر سکتے ہیں۔

اگر چند چیزیں اندھیرے میں رکھی ہوں۔ اور ان میں ایک چراغ رکھ دیا جائے۔ تو ہم ہر ایک چیز کو پہچان سکتے ہیں۔ جان سکتے ہیں۔ اور ان میں حسب ضرورت یا حسب پسند کسی ایک کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح بالغ نظری ہے

جہاں بالغ نظری کی حدود ختم ہوتی ہیں۔ وہاں سے فراست کی حد شروع ہوتی ہے۔

فراست وہ صفت ہے جس کے ذریعے ہم کسی چیز کی قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں یا اس کے مفید ہونے کے متعلق سوچ سکتے ہیں

اس کے بعد مصلحت اندیشی آتی ہے۔ جو ہمیں بتا سکتی ہے کہ کون سا کام نقصان دہ ہوگا

مصلحت اندیشی کی امداد کے لیے پھر بصیرت قدم بڑھاتی ہے۔ ہم دور دور کی سوچتے ہیں۔ کامیابی کی طرف ہمارا قدم خود بخود اٹھنے لگتا ہے۔

ان تمام صفات کو جِلا دینے کے لیے استدلال بروئے کار آتا ہے۔ وہ ہمیں حالات کے مطابق اس خاص عمل کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ جو حالات کا تقاضا ہے۔

استدلال اور اس سے نتیجہ اخذ کرنا یہ فکر کی آخری منزل ہے۔

اس کے بعد وہ منزل آتی ہے جسے ہم نے سکون کہا ہے مندرجہ بالا صفات کا مجموعہ۔ ان صفات کے ہوتے ہوئے جب ہم کسی عمل کے لیے قدم اُٹھاتے ہیں۔ تو بھلا ممکن ہے کہ کامیابی قدم نہ چومے۔

روزمرہ کی زندگی کی بنیاد اگر مندرجہ بالا صفات پر رکھی جائے ہر بات نہایت سکون سے کی جائے۔ تو پھر معاملہ خواہ کتنا اہم ہو یا معمولی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ ایسے شخص کی ذات جس میں یہ صفات ہوں۔ قابل توجہ بن جاتی ہے۔ لوگوں کو اس سے مل کر اور کاروبار کرتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے۔

اگر ایک بار لوگوں کو یقین ہو جائے کہ کاروبار میں اُن سے دھوکا نہیں کیا جائے گا۔ تو پھر اُن کا یقین کبھی متزلزل نہیں ہوتا اس یقین کو پیدا کرنے میں ہی کاروبار کی کامیابی کا راز ہے۔

جس شخص نے اس راز کو پا لیا اور اس کو اپنا لیا۔ اس نے کردار کو بلند کیا۔ یہ راز اپنا ہی قوت کردار ہے۔

کامیابی خود نہیں آتی۔ بلکہ لائی جاتی ہے۔ اس کو لانے کے لیے کردار کی ضرورت ہے۔ ورنہ محض انتظار کرنے سے فائدہ؟
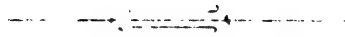
باب دسواں

روزمرہ زندگی

خوشی حاصل کرنا ہماری انفرادی کوشش پر منحصر ہے جتنی کوشش کی جائے گی۔ اسی نسبت سے خوشی میسر آئے گی ہم میں سے کون ہے جس کی یہ تمنا نہ ہو کہ اس کی زندگی میں باقاعدگی ہو۔ اس میں ضبط نفس ہو۔ اس کے دماغی توئی بیدار ہوں۔ تاکہ وہ ایک کامیاب انسان کی طرح زندگی بسر کر سکے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر ذی عقل انسان کوشش کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوشش کرنے کے طریق مختلف ہوتے ہیں۔ بعض حالات میں تو ہم بہت سے ایسے کام کرتے ہیں جن میں کامیابی کے بعد ہم اپنے اس ایک مقصد کی جانب

جا سکتے ہیں۔ جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ مگر زیادہ کامیاب وہ ایک قدم ہے جس کے اٹھانے سے ہم اپنے مقصد کے قریب تر ہو جاتے ہیں۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں اول الذکر طریق عام ہے اور موخرالذکر شاذ شاذ

روزمرہ زندگی میں ہم کوئی ایسے اہم مقاصد سامنے رکھ کر نہیں نکلتے۔ بلکہ چھوٹے چھوٹے واقعات ہوتے ہیں جو مل کر ایک خالی حالت اختیار کر لیتے ہیں۔

گھر میں ایک عورت کے لیے بچوں کی تعلیم، ان کی تربیت، گھر کی دیکھ بھال، کھانے کا انتظام، نوکروں کی دیکھ بھال اور اسی قسم کے معمولی معمولی کام مل کر اس میں صبر، استقلال، قوتِ فیصلہ اور فراست ایسی صفات پیدا کر دیتے ہیں اور یوں اس کا کردار مضبوط ہوتا رہتا ہے۔

انھیں معمولی معمولی باتوں پر سارے گھر کا امن اور چین منحصر ہے عورت اگر ان کاموں کو خوبصورتی سے سرانجام دے سکے تو معمولی سا گھر بھی جنت بن جائے۔ ورنہ گھر پر خواہ آرائش اور زیبائش کی حد کر دی جائے۔ مگر عورت کا کردار بلند نہ ہو تو یہ گھر جہنم کا نمونہ ہو گا۔ گھر کے ماحول کا اثر مرد کے ذہن پر ہوتا ہے۔ گھر کا ماحول جتنا پرسکون ہو گا۔ مرد اسی قدر زیادہ اسے چاہے گا۔ عورت اگر بات بات پر بدمزاجی کا مظاہرہ کرنے لگے، اُسے اپنے آپ پر قابو نہ رہے، خادم اس سے نالاں ہوں، بچوں کو مار پیٹ ہوتی رہے تو ایسے گھر میں داخل ہونے والا مرد کب خوش رہ سکتا ہے۔ وہ تو اس عذاب سے نجات

پانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گا۔

جس گھر میں کردار کے قدم جمے اس گھر سے ساری برائیاں بھاگ گئیں۔ سوچ بچار کے سامنے بھلا ان کے پاؤں ٹھہر سکتے ہیں۔ صداقت اور دیانت داری کردار کے مختلف پہلو ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کب عمل میں سستی اور ڈھیلا پن آسکتا ہے

مستقل مزاجی ایک ایسی طاقت ہے جس کا زیر عمل لانا ہر حالت میں ضروری ہے۔ روزمرہ زندگی میں ہمارے افعال خواہ معمولی ہوں یا اہم۔ مگر ان میں مستقل مزاجی کا ہونا ازحد ضروری ہے

بچے کے لیے اس کا ماحول اس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ اُن لوگوں کے ایسی حرکات کرتا ہے جو اس کے ارد گرد رہتے ہیں ان کی تربیت کرنے والوں کی بہت سی عادتیں ان میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ اگر کوئی بچہ فطری طور پر باغی ہے اور وہ دوسروں کا کہنا نہیں مانتا۔ تو اس کے باوجود وہ اپنے اُستاد سے متاثر ہوتا رہے گا۔ بعض حالات میں یہ تاثر اس کی طبیعت کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔

کسی کا اچھا نمونہ ایک ایسا نقش ہے جو دماغ پر خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ اس کے ذریعے ہم وہ کچھ سیکھ سکتے ہیں جو تعلیم ہمیں نہیں سکھاتی۔ ایسے نقوش ذہن پر اپنا خاموش اثر ڈالتے رہتے ہیں جو بالآخر لاشعوری طور پر زندگی کو ایک نئی ڈگر پر چلانے لگتے ہیں۔

کردار کو پیدا کرنے اور اُسے بلند کرنے کے لیے یہ ازحد ضروری ہے۔ کہ کردار کی تعلیم بچوں کو اوائل عمر سے ہی دی جایا

کرے۔ تاکہ وہ آہستہ آہستہ مضبوط ہو کر جوانی میں ارتقاء کے منازل طے کر سکیں۔ اس کے لئے سب سے بہتر نمونہ ہے۔ بچے کے سامنے نمونہ جس قدر بلند اور اچھا ہو۔ اس کا کردار بھی بلند ہوگا۔

بچے کے لیے بہترین نمونہ ماں باپ ہی ہو سکتے ہیں۔ اور ماں باپ سے زیادہ بچے پر کوئی اور اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا لائحۂ عمل انھیں ہمیں سے ملتا ہے۔ زندگی بچپن کے چند سالوں ہی میں بنتی یا بگڑتی ہے۔ تربیت اگر صحیح ہے تو وہ بچہ جوان ہو کر زندگی کے مشکل ترین مقامات سے نہایت اچھی طرح نکل جائے گا۔ بلند کردار ہمیں زندگی کی تلخیوں میں زیادہ کام آتا ہے۔

زندگی کی صبح بہت دلفریب ہے۔ شباب کا زمانہ جب اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ آتا ہے تو پھر کون ہے جو بہک نہ جائے۔ زندگی کے سبز باغ اس وقت اتنے رنگین نظر آتے ہیں کہ دل للچانے لگتا ہے۔ مگر یہ ساری دلفریبیاں سارے باغ محض ایک دھوکا ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے تاریک غار ہیں۔ گناہ کے مہیب کھنڈرات۔ جوانی میں ذرا سا قدم لڑکھڑایا تو پھر ٹھکانہ نہیں۔

جوانی کا ایک تو یہ اخلاقی پہلو ہے اور دوسرا معاشی۔ زندگی کی اس منزل پر پہنچ کر فکر معاش لاحق ہونے لگتی ہے۔ اس وقت پریشانی اور مستقبل کی فکر گھیر لیتی ہے۔ اس وقت

کردار کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جتنا کردار مضبوط ہوگا۔ اسی قدر وہ اس نازک مرحلے پر مدد و معاون بنے گا۔

زندگی کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ ہمیں اپنے مذاق کے مطابق کام مل جائے۔ ایک کمزور کردار کا مالک "جو کچھ ملجائے" اسی پر قانع رہے گا۔ لیکن ایک مضبوط کردار والا تگ و دو کرے گا۔ وہ اپنے مذاق کے مطابق زندگی کی جگہیں نکالے گا۔ اس تگ و دو اور کشمکش میں زندگی کا اصل جوہر ہے۔ اس کے بعد جب کامیابی آتی ہے۔ تو وہ کتنی حسین معلوم ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو زندگی سے چمٹے رہتے ہیں اور جنھیں رات دن یہی فکر ہے کہ کہیں زندگی انھیں چھوڑ نہ دے اور وہ لوگ جو زندگی سے مقابلہ کرکے اس پر قابو حاصل کرنے کے درپے رہتے ہیں دونوں میں کتنا فرق ہے۔ ایک سست اور کاہل الوجود ہے اور دوسرا فعال اور چاق و چوبند۔ ایک وقت کے گزر جانے کو غنیمت جانتا ہے اور دوسرا وقت کی قیمت کا اندازہ لگاتا رہتا ہے۔ اور وہ اُس کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔

اس کے بعد جیون ساتھی کا مسئلہ آتا ہے۔ اس میں بھی کردار کی بلندی کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں اپنی مرضی کی شادی کا رواج نہیں۔ مگر اس کے باوجود ہم موجودہ حالات کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

سمندر میں سفر کرنے کے لیے ایک خوبصورت جہاز جسکی ظاہری آرائش ہماری آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہو۔ اگر اس کا انجن

خراب حالت میں ہو ــــــ کام نہیں دے گا۔ کیونکہ ہر وقت اس کے خراب ہونے کا اندیشہ لاحق رہتا ہے۔ یہی حال شادی کا ہے۔ اگر ہمارا ساتھی محض زیوروں سے لدا ہے۔ تو اس سے زندگی بہتر نہیں بن سکے گی۔ بلکہ زندگی تو اس پریم اور محبت کا نام ہے جو ان دو دلوں کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جب یہ دونوں ایک دوسرے کو خوب جان لیں۔ سمجھ لیں۔ ان کی طبیعتیں مل جائیں۔ تو پھر گھر جنت کا نمونہ ہوگا۔ یہاں نہ سونے کی ضرورت ہے اور نہ چاندی کی۔

جب یہ دونوں ساتھی ایک دوسرے کی کمزوریوں کو درگزر کرنا سیکھ جائیں۔ ان میں تحمل اور برداشت پیدا ہونے لگے۔ تو یہ زندگی ارتقائی منازل طے کرنے لگے گی۔ تحمل اور درگزر بہت کڑا امتحان ہوتا ہے۔ اس میں کامیاب ہونے کے لیے صرف قوت کردار کی ضرورت ہے۔

اگرچہ ہم اپنی زندگی کے مالک ہیں۔ مگر قانون کی تشریح ہر ایک کے لیے مختلف ہوتی ہے۔ ہر کوئی اپنی حالت کے مطابق اس کی تحویل کرتا ہے۔ ایک تجار سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ ایک حاکم کا کام سرانجام دے۔ ایک ادیب یا ایک موسیقار ان حالات پر کیسے اتر سکتا ہے جو حالات ایک دستکار کے لیے موزوں ہوتے ہیں۔

زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک حقیقت اور دوسرے ہمارے خیالات۔ ان دونوں میں ایک بیّن فرق ہے۔ حقیقت ہر حالات میں مختلف ہوتی ہے، مگر ایک قسم کے خیالات سب کو ایک طرح

متاثر کرتے ہیں۔

جب ہمارے فیصلے متضاد ہوں۔ تو اس سے ہماری کمزوری کا پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ یہ کمزوری ہمارے تفکر اور استدلال پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک فیصلہ نہیں کر سکتے بلکہ گومگو میں متضاد فیصلے کرنے لگتے ہیں۔

جب متضاد فیصلے ہوں تو ان میں صرف دروغ بیانی کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ یہ جھوٹ مدافعت کا سب سے بودا فیصلہ ہے۔ کمزور کردار کا مالک اس حیلے سے زیادہ کام لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے ذریعے وہ دفع الوقتی کے طور پر زیادہ کام لے سکے گا حالانکہ وہ نہیں جانتا ہے کہ جب اس کے ڈھول کا پول کھل گیا تو اس کی زیادہ رسوائی ہوگی۔ اسے زیادہ نقصان ہوگا۔ اگر اس میں تھوڑی سی ذہانت ہوتی وہ صاف بیانی سے کام لیکر دیکھتا اور اسے محسوس ہوتا کہ یہ صاف گوئی کتنی کارآمد شے ہے۔ اس میں ایک قوت پیدا ہوتی۔ ایسی قوت جو اسے دوسروں کی نگاہ میں بلند کر دیتی۔

ایک جھوٹ کو برقرار رکھنا بہ نسبت سچائی کی دشواریوں کا سامنا کرنے سے بھی زیادہ مشکل ہے

صاف گوئی اور صفائی قلب ایک ایسی عادت ہے جس کی وجہ سے انسان کو بہت کم روحانی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے ظاہری دکھ ہوں گے۔ مگر اس شخص کا دل مطمئن ہوگا۔ دروغ گو پر خود اس کا اپنا ضمیر ملامت کرتا ہے۔ اس شخص کے اخلاق سے

اخلاص کم ہونے لگتا ہے۔ وہ دوسرے کو دھوکا نہیں دیتا
بلکہ خود کو دھوکے میں رکھتا ہے۔

روزمرہ زندگی میں جھوٹ کی عادت ایک فتنہ ہے۔ جو
بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اس سے دوسروں کو ہی صرف تکلیف یا
نقصان نہیں ہوتا بلکہ خود دروغ گو کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے
بات بات میں ریاکاری کا باعث دبی کردار کی کمزوری ہے۔ کیونکہ اس
طرح ریاکار سمجھتا ہے کہ وہ زندگی کی مشکلات پر قابو پا سکے گا۔
حالانکہ وہ نہیں سمجھتا کہ عارضی بچاؤ حقیقی خطرے کو کم نہیں کر سکتا۔
اگر اس کے الفاظ ایک شریف آدمی کو تھوڑی دیر کے لیے دھوکا
دے سکتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ حقیقت ہی بدل گئی ہے
دوسروں کو دھوکے میں رکھنے کی کوشش میں دھوکا باز اپنی حفاظت
کرنا بھول جاتا ہے اور اس بھول کا اسے خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

روزمرہ کی زندگی میں جھوٹ بولنے کا میلان کیوں پیدا
ہوتا ہے۔ تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تہہ میں دو
جذبات کارفرما نظر آتے ہیں۔ پہلا جذبہ خود نمائی کا ہے۔ وہ شخص
کچھ کر کے اپنے آپ کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس شخص میں
اتنی قوت نہیں ہوتی کہ وہ اچھے نتائج پیدا کر سکے۔ اس لیے وہ ارد
گرد کے حالات کو ہی بدلنا چاہتا ہے۔ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے
کے لیے یہی سہل طریق سمجھتا ہے کہ وہ ریاکاری کرے۔ جھوٹ بولے
اور اپنا مطلب نکال لے۔ اسے شاید اس میں کامیابی بھی ہو جائے
مگر اس کا انجام ہمیشہ بُرا ہوا ہے۔ ایسے شخص کے سارے جھوٹ

خود اس کی اپنی حماقت سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔

دوسرا جذبہ کاہلی کا ہے۔ ذرا سی تکلیف بھی برداشت کرنی مشکل نظر آتی ہے۔ کون زندگی کے جنجال میں پھنس جائے۔ اس سے نکلنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا جاتا ہے۔

ایک جھوٹ کو سنبھالنے کے لیے دوسرا جھوٹ بولنا ضروری ہوتا ہے اور پھر یہ سلسلہ لامتناہی ہو جاتا ہے۔ جھوٹ بولنے والے کا حافظہ بھی کمزور ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا پکڑا جانا چنداں مشکل نہیں۔

جو شخص جھوٹ کا عادی ہو جائے۔ اس کی زندگی حرام ہو جاتی ہے۔ بداعتمادی اس کی زندگی کی ساری مسرتوں اور سکون کو تباہ کر دیتی ہے۔ اس کا یقین کوئی نہیں کرتا۔ لوگ اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں یہ نفرت اس کی زندگی کی خوشیوں کو جلا کر راکھ کر ڈالتی ہے۔

جب جھوٹ فطرت ثانی بن جائے تو پھر دماغ کی بلند پروازی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ شخص زندگی کے تاریک کونے تلاش کرتا ہے۔ اسے روشنی سے خوف آتا ہے۔ کہیں اس کا کوئی جھوٹ ظاہر نہ ہو جائے۔ اس کا ذہن ہر وقت بچاؤ کے طریق سوچنے میں مصروف رہتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ یہی سوچ بچار اپنی ترقی اور خوشحالی کے لیے خرچ کرتا تو یقیناً وہ ایک کامیاب انسان ہوتا۔

نگارشاتِ محمد علی	رئیس احمد جعفری	تین روپیہ بارہ آنہ
مقالاتِ محمد علی اول	" "	تین روپیہ بارہ آنہ
مقالاتِ محمد علی دوم	" "	تین روپیہ بارہ آنہ
خطباتِ محمد علی	" "	دو روپیہ آٹھ آنہ
مکالماتِ ابوالکلام	عقیل احمد جعفری	تین روپیہ بارہ آنہ
فیصلہ ہندوستان	عبدالقدوس ہاشمی	پانچ روپیہ
معاشیاتِ پاکستان	" "	ایک روپیہ آٹھ آنہ
تقاریرِ جناح	عثمان صحرائی	تین روپیہ چار آنہ
سیاسی نظریے	اکرام قمر	ایک روپیہ آٹھ آنہ
مقامِ جمال الدین افغانی	مبارز الدین	تین روپیہ چار آنہ
یقین و عمل۔	عبدالقدوس ہاشمی	دو روپیہ آٹھ آنہ
زندگی کی ٹھوکریں	رئیس احمد جعفری	تین روپیہ چار آنہ
قائدین کے خطوط جناح کے نام	سعید	دو روپیہ
ناسیت۔	شاہ حسین رزاقی	دو روپیہ بارہ آنہ
ان پڑھ ہندوستان۔	فخر الحسن	تین روپیہ چار آنہ
اسلامی تہذیب کیا ہے۔	غلام دستگیر	دو روپیہ آٹھ آنہ
قصص و مسائل	مولانا عبدالماجد دریابادی	ایک روپیہ بارہ آنہ
ابوذر غفاریؓ	مولانا مناظر احسن گیلانی	دو روپیہ بارہ آنہ
کاروانِ علم	فیض محمد بادشاہ حسین	تین روپیہ

گھر اور زندگی	بلقیس بیگم	تین روپیہ
بچوں کی نفسیات	سید محمد اختر	ایک روپیہ بارہ آنہ
نفسیاتِ زندگی	۔ ۔	۔ ۔ ۔ ۔
شخصیت و کردار	۔ ۔	دو روپیہ چار آنہ
کیا اور کیوں؟	افضل حسین فاروقی	بارہ آنہ
نثر ریاض	ریاض خیرآبادی	دو روپیہ بارہ آنہ
میخانۂ ریاض	تسنیم مینائی	تین روپیہ چار آنہ
نغماتِ ماہر	ماہر القادری	تین روپے
محسوساتِ ماہر	۔ ۔	دو روپیہ بارہ آنہ
اسرار	علی اختر	دو روپے بارہ آنہ
کلیاتِ حسرت	حسرت موہانی	تین روپے
تاجِ سخن	فصاحت جنگ جلیل	تین روپے
شرح دیوان غالب	حسرت موہانی	ایک روپیہ
سزا	قیسی رامپوری	دو روپیہ چار آنہ
دھوپ	۔ ۔	تین روپیہ چار آنہ
سراب	مجنوں گورکھپوری	تین روپیہ چار آنہ

صیدِ زبوں	مجنوں گورکھپوری	دو روپیہ
کردار	ماہر القادری	دو روپیہ چار آنہ
وسوسے	فضل حق قریشی	دو روپیہ بارہ آنہ
آج کل کے افسانے	〃	دو روپیہ چودہ آنہ
ولولے	قدوس صہبائی	دو روپیہ بارہ آنہ
جلوۂ رنگین	ڈاکٹر محمد نصیر الدین	تین روپیہ
گرداب	احمد ندیم قاسمی	تین روپیہ چار آنہ
لہریں	شفیق الرحمٰن	دو روپیہ چودہ آنہ
زلزلے	قدوس صہبائی	دو روپے بارہ آنے
نگینے	مظفر حسین شمیم	دو روپیہ بارہ آنہ
تعبیریں۔	محمد امین شرقپوری	دو روپیہ چودہ آنہ
مسکراہٹیں۔	کوثر چاندپوری	دو روپیہ بارہ آنہ
رنگین سپنے	〃	دو روپیہ بارہ آنہ
کروٹیں	قدوس صہبائی	دو روپیہ بارہ آنہ
افسانے ڈرامے	سعادت حسن منٹو	دو روپیہ بارہ آنہ
انگڑائیاں	احمد ندیم قاسمی	تین روپیہ چار آنہ

سیلاب	احمد ندیم قاسمی	تین روپیہ آٹھ آنہ
اقبال کا تصور زماں	ڈاکٹر رضی الدین	بارہ آنہ
سیاستِ جاپان	علی امام بلگرامی	دس آنہ
زندگی کے نئے زاویے	رئیس احمد جعفری	تین روپیہ
جمہوریہ چین	میر عابد علی	ایک روپیہ بارہ آنہ
ٹیگور اور ان کی شاعری	مخدوم محی الدین	ایک روپیہ آٹھ آنہ
تقدیریں	منظور بخاری	ایک روپیہ
پریم پجارن	قدوس صہبائی	پندرہ آنہ
حجِ زینب	محسن بن شبیر	تین روپیہ
مجنوں کے خطوط	عطاء الرحمٰن	دو روپیہ آٹھ آنہ
کاشانۂ نادر	- -	ایک روپیہ بارہ آنہ
خواتین دکن کی اردو خدمات	نصیر الدین ہاشمی	دو روپیہ
ضیغم	سعیدہ مظہر	ایک روپیہ آٹھ آنہ
غبار	قیسی رامپوری	دو روپیہ چار آنہ
دل کی آگ	ظفر واسطی	ایک روپیہ بارہ آنہ
لال کوٹھی	تبسم نظامی	تین روپیہ چار آنہ

چاند بی بی سلطانہ	وزیر حسن	تین روپیہ بارہ آنہ
کامیاب افسانے	وزارت انصاری	ایک روپیہ آٹھ آنہ
زرد چہرے	ابراہیم جلیس	دو روپیہ چار آنہ
روسی ظرافت	ضیائی	دو روپیہ چار آنہ
فلمی تتلیاں	بجلی جامپوری	تین روپیہ
یورپ کے تاثرات	بدر شکیب	دو روپیہ آٹھ آنہ
ناخواندہ مہمان	بادشاہ حسین	ایک روپیہ آٹھ آنہ
مسز سمپسن ۔	" "	ایک روپیہ
اردو کا سب سے بڑا شاعر		ایک روپیہ آٹھ آنہ
جنات کی دنیا ۔	مقبول احمد سیوہاروی	ایک روپیہ چار آنہ
گاندھی جناح مراسلت ۔	ضیائی	دس آنہ
اقبال کے خطوط جناح کے نام		چھ آنہ
ابن خلدون ۔	عبد القادر	چھ آنہ
ہٹلر کا نیا نظام	امتیاز حسین	دس آنہ
خدا اور کائنات	ماہر القادری	نو آنہ
سیاروں پر زندگی	محمد عبد الرحمن	نو آنہ

شادی و محبت ۔ مقصودہ فرحت بارہ آنہ

تذکرہ یورپین شعرائے اردو محمد سردار علی بارہ آنہ

بخارا کا جمہوری انقلاب قدوس صہبائی نو آنہ

ترکستانی خاتون شاہراہِ انقلاب پر نو آنہ

مرد انقلاب صہبائی بارہ آنہ

گاؤدی عروج چودہ آنہ

ستارے نجم آفندی دس آنہ

جنگل کانفرنس حیرت بدایونی دس آنہ

رسول پاک کی صاحبزادیاں ۔ قدوسی ساڑھے بارہ آنہ

فکرِ اقبال ۔ چار روپیہ چالیس کروڑ بھکاری ۔ دو روپیہ بارہ آنہ

حکمتِ اقبال ۔ چار روپیہ کرنل لارنس ۔ دو روپیہ بارہ آنہ

تصوراتِ اقبال ۔ تین روپیہ چھ آنہ اسلام کے سیاسی تصورات دو روپیہ بارہ آنہ

مظلوم دوشیزہ تین روپیہ داستان کربلا ۔ دو روپیہ چودہ آنہ

طوفان تین روپیہ چھ آنہ حادثے ۔ دو روپیہ چار آنہ

پیٹ کی ماری ایک روپیہ بارہ آنہ تکونا دیس دو روپیہ بارہ آنہ

کوہ نور کی سرگزشت ۔ ایک روپیہ چار آنہ